اقبالیات

شمارہ۔ ۲۱

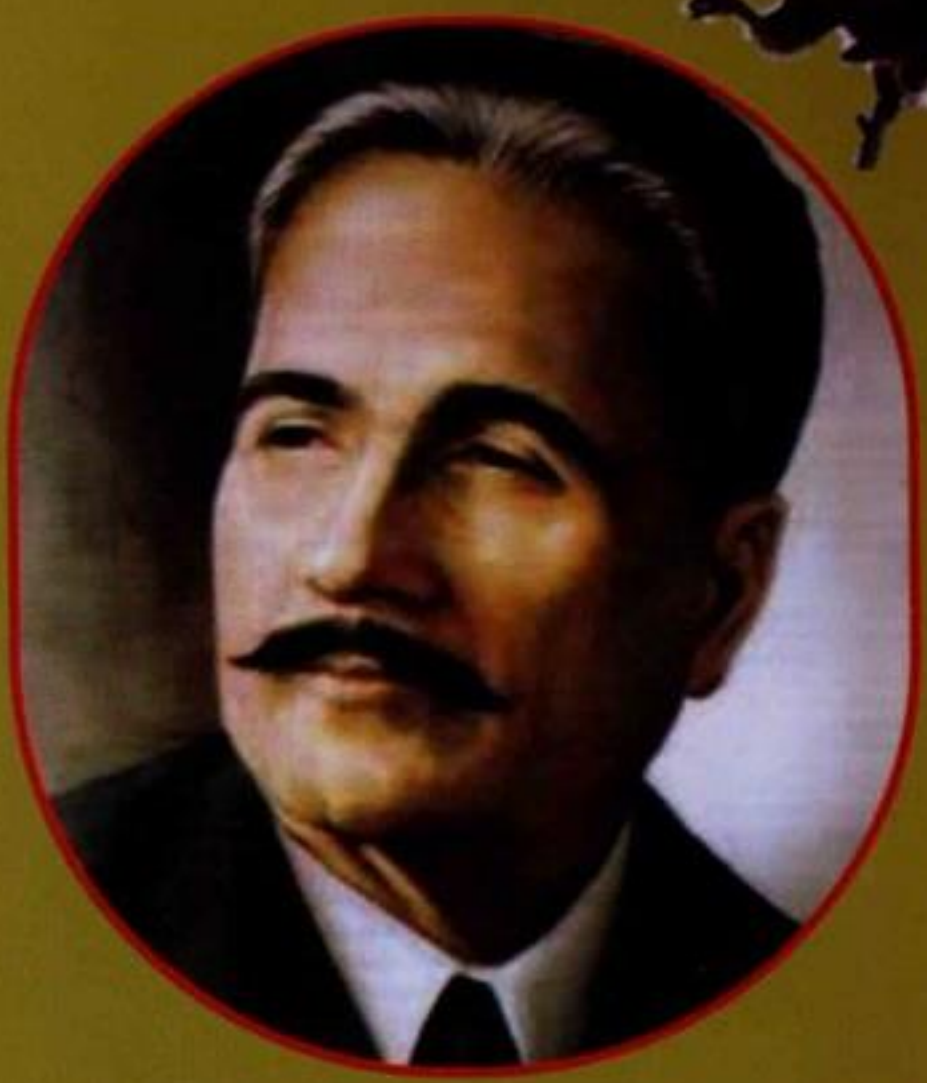

ترتیب و تہذیب

پروفیسر تسکینہ فاضل

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، حضرتبل سرینگر

اقبالیات

شمارہ ۔ ۲۱

ترتیب وتہذیب

پروفیسر تسکینہ فاضل

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر یونیورسٹی حضرتبل سرینگر

(جملہ حقوق بحق اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی محفوظ)

سنہ اشاعت: نومبر ۲۰۱۲ء

تعداد اشاعت: پانچ سو (۵۰۰)

کمپوزنگ: محمد خالد ملک

آئی۔ایس۔ایس۔این: 0975-6604

قیمت: ۲۵۰ روپے

مطبع: شارجہ پریس سرینگر

ملنے کا پتہ

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر یونیورسٹی سرینگر۔ حضرتبل۔ ۱۹۰۰۰۶

ای۔میل۔ iqbalinstituteku@yahoo.in

اقبالیات

شمارہ۔۲۱۔ ۲۰۱۲ء

مجلس مشاورت:

☆ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

☆ پروفیسر غلام رسول ملک

☆ پروفیسر عبدالغنی مدہوش

☆ پروفیسر ابوالکلام قاسمی

☆ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

☆ پروفیسر محمد شاہد حسین

☆ پروفیسر نذیر احمد ملک

☆ پروفیسر مجید مضمر

☆ ڈاکٹر عبدالرشید بٹ

مندرجات

☆ تعارف ۱۔۴

☆ عصری مسائل کا حل فکر اقبال کے تناظر میں.....بحوالہ کشمیر — پروفیسر مرغوب بانہالی — ۵۔۱۲

☆ مسجدِ قرطبہ.....مطالعے کی نئی جہات — پروفیسر ظہور الدین — ۱۳۔۲۵

☆ اقبالِ کشمیر — غلام نبی خیال — ۲۶۔۳۲

☆ کشمیر میں اقبال شناسی کی ایک زریں لہر.....غنی کی بصیرت — پروفیسر مرغوب بانہالی — ۳۳۔۳۸

☆ اُردو نظم پر اقبال کے اثرات.....(بحوالہ راشد اور فیض) — پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی — ۳۹۔۴۷

☆ کشمیر میں اقبال شناسی.....ایک مختصر جائزہ (۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۰ء تک) — پروفیسر بشیر احمد نحوی — ۴۸۔۵۴

☆ غلام نبی گونی کی شاعری پر اقبال کے اثرات — پروفیسر شہاب عنایت ملک — ۵۵۔۶۷

☆ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف "اسرار خودی" کا منظوم کشمیری ترجمہ — پروفیسر تسکینہ فاضل — ۶۸۔۷۷

☆ پروفیسر غلام رسول ملک بحیثیت اقبال شناس..... ایک مختصر تعارف — ڈاکٹر بدر الدین بٹ — ۷۸۔۹۹

☆ عبدالاحد آزاد پر اقبال کے اثرات — ڈاکٹر نذیر آزاد — ۱۰۰۔۱۱۱

☆ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس (ایک تحقیقی جائزہ) — ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی — ۱۱۲۔۱۲۱

☆ جموں و کشمیر میں اقبال شناسی.....مسائل، امکانات اور خدمات — ڈاکٹر ریاض توحیدی — ۱۲۲۔۱۲۵

☆ اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی.....ایک جائزہ — ڈاکٹر عرفان احمد ملک — ۱۲۶۔۱۴۱

☆ اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کی طرف سے سال رواں ۲۰۱۲ء کے لئے ایم فل اور پی ایچ ڈی اسکالروں کو تفویض کئے گئے موضوعات کی فہرست — ۱۴۲۔۱۴۴

انگریزی مضامین

☆ Iqbal Institute and its Contribution to Iqbalian Studies — Prof. Hameed Naseem Rafiabadi — 1-6

☆ Studies on Iqbal's Legal Thought in Kashmir An Approach to Prof. Muhammad Altaf Husain Ahanger's Paper — Dr. Abdul Rashid Bhat — 7-16

ہمارے قلمی معاونین

پروفیسر مرغوب بانہالی	سابق صدر شعبۂ کشمیری کشمیر یونیورسٹی سرینگر
غلام نبی خیال	کشمیری ادیب اور بزرگ صحافی
پروفیسر ظہور الدین	سابق صدر، شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں
پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی	سابق صدر، شعبۂ اُردو جامعہ ملّیہ اِسلامیہ۔ نئی دہلی
پروفیسر علی احمد فاطمی	سابق صدر، شعبۂ اُردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور
ڈاکٹر بدر الدین بٹ	سابق صدر، شعبۂ عربی اسلامیہ کالج
پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی	صدر، شاہ ھمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز کشمیر یونیورسٹی سرینگر
پروفیسر بشیر احمد نحوی	سابق ڈائریکٹر، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی سرینگر
ڈاکٹر عبد الرشید بٹ	سینئر ایسوسی ایٹ پروفیسر شاہ ھمدان انسٹی آف اسلامک اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی سرینگر
پروفیسر شہاب عنایت ملک	صدر، شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں
ڈاکر مشتاق احمد گنائی	ریسرچ ایسوسی ایٹ، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
ڈاکٹر نذیر آزاد	صدر، شعبۂ اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج فار وومن مولانا آزاد روڈ، سرینگر
پروفیسر تسکینہ فاضل	ناظم، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

تعارف

مجلّہ اقبالیات کا اکیسواں شمارہ حاضر خدمت ہے۔ یہ مجلّہ اُن مقالات و مضامین پر مشتمل ہے جو ۲۰۱۱ء میں جامعہ کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے اہتمام سے منعقد کئے گئے سہ روزہ قومی سمینار بعنوان ''جموں و کشمیر میں اقبالیات..... مسائل، امکانات اور خدمات'' میں پڑھے گئے تھے۔ مجلّہ کی اشاعت میں بعض اسباب کی بنا پر تاخیر ہوئی، بقول شاعر ؎ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا، بہر حال دیر آید دُرست آید۔ دراصل حکیم الامت علامہ محمد اقبال اُردو اور فارسی شعراء کی کہکشاں میں وہ خوش بخت شاعر ہیں جن پر سب سے زیادہ ذخیرہ کتب منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ اُن پر تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز تو اُن کی حیات میں ہی ہوا تھا، اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور اس سلسلہ کے مستقبل میں بھی جاری رہنے کے قوی امکانات ہیں۔ اصل میں یہ فکر اقبال کی قوت و توانائی ہے جو لکھنے والوں کو اُن کی طرف راغب کرتی رہی ہے۔ اقبال کو گرچہ پیغمبر نہیں کہا جا سکتا تاہم اُنہوں نے شاعری سے پیغمبری کا کام لیا۔ وہ شاعری کی مقصدیت کے دِل سے قائل تھے۔ چنانچہ پوری دُنیا میں اُن کے فکر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جہاں دُنیا کی مختلف زبانوں میں اُن پر کتابیں اور مقالات شایع ہو چکے ہیں وہاں جموں و کشمیر کی ریاست سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانش نے بھی اپنے اس محبوب مفکر شاعر کو موضوع بنانے میں فخر و مباہات محسوس کیا ہے۔ اقبال کے آبا و اجداد کا وطن کشمیر تھا، اُنہیں کشمیر سے بے پناہ محبت تھی۔ پہلی مرتبہ وہ ۱۹۲۱ء میں مولوی احمد دین وکیل اور منشی طاہر دین کے ہمراہ کشمیر آئے تھے۔ ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے عنوان سے انہوں نے کشمیر کی نسبت کئی اشعار کہے ہیں۔ جنت نشاں کشمیر کے فطری مناظر کے ساتھ گہرا لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اہلِ کشمیر کی محکومی اور غلامی کو دُور کرنے اور اُنہیں دوبارہ باوقار زندگی گذارتے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ کشمیر کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور مظلومین کشمیر کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم میں بھی حصہ لیتے رہے تھے۔ اِسی طرح وہ انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کے سیکرٹری بھی تھے۔ کشمیر کے شعرا پر اقبال کے گہرے اثرات رہے ہیں۔ یہاں کے ادیبوں نے دِل کھول کر اقبال کی

شاعری اور فکر کی خوبیوں کو سراہا ہے۔ کبھی نثر میں تو کبھی نظم میں۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، کشمیر میں اقبال شناسی کا آغاز اُن کی حیات میں ہی ہوا۔ منشی محمد الدین فوق، منشی سراج الدین، چودھری خوشی محمد ناظر، خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد وغیرہ وغیرہ وہ شعرا اور ادبا ہیں، جنہوں نے اقبال کی شاعری اور فکر کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اُن پر مبسوط کتابیں تصنیف کرنے کے علاوہ مقالات بھی لکھے۔ منشی محمد الدین فوق نے سب سے پہلے اقبال کے حالات زندگی مع تصویر اپریل ۱۹۰۹ء میں ''کشمیری میگزین'' میں لکھ کر شایع کیے۔ موصوف نے اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۵ء قرار دیا ہے، گرچہ فوق صاحب کا اقبال پر یہ سوانحی مضمون تھا تاہم اُنہوں نے اپنی دیگر تحریروں میں بھی اقبال کے حالات زندگی، آبائی گاؤں اور ذات وغیرہ سے بحث کی ہے۔ اسی طرح مولوی احمد دین نے ۱۹۲۴ء میں اقبال پر ایک کتاب لکھ کر شایع کی۔ چونکہ اقبال نے اس کتاب کو ناپسند کیا، اِس لئے مولوی صاحب نے اس کتاب کے تمام نسخے نذر آتش کیے اور پھر علامہ کی خواہش کے مطابق اِسے ۱۹۲۶ء میں دوبارہ شائع کرایا۔

اُردو ادب کی ایک نامور شخصیت پروفیسر آل احمد سرور نے ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی وزارت اعظمی کے ایام میں انہیں کی فرمائش پر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال پر ایک لیکچر دیا۔ شیخ محمد عبداللہ اقبال کے زبردست شیدائی تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جامعہ کشمیر کی دعوت پر تین لیکچر تیار کیے لیکن کسی وجہ سے وہ انہیں یونیورسٹی میں پیش نہ کر سکے۔ پھر کئی سال بعد اُن کے یہ تین خطبات اُن کی کتاب ''اقبال اور اُس کا عہد'' کے عنوان سے شایع ہوئے۔ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر یونیورسٹی میں ۱۹۷۷ء میں اقبال چیئر قائم کی۔ اُردو دُنیا کی سربرآوردہ شخصیت پروفیسر آل احمد سرور کو اس چیئر کا پروفیسر اور بعد میں ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ سرور صاحب کی محنت شاقہ اور ان تھک کوششوں کے نتیجے میں اِس چیئر کو دو سال بعد یعنی ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ اپنی آفرینش سے سمیناروں، مذاکروں، توسیعی خطبات، مباحثوں اور بیت بازی کے مقابلوں کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ، ڈی اسکالروں کی نگرانی کے ذریعے اقبال کے نور بصیرت کو عام کرتا رہا ہے۔ اِس ادارے سے آج تک جن معتدد سمیناروں، اور توسیعی خطبات کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے، اُن میں ممتاز اقبال شناسوں کے علاوہ بلند پایہ علماً اور ادباً شرکت کرتے رہے ہیں۔ ادارے سے آج تک اسی ۸۰ (بشمول اقبالیات کے ۲۰ شمارے)

کے قریب تصنیفات وتالیفات شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ نیز ایم فل اور پی ایچ، ڈی کے اسی ۸۰ اسکالر فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ دراصل کشمیر میں اقبال پر ہوئے کام کو مختلف عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال پر تصنیفات وتالیفات کی اشاعت، اقبال پر منظومات اور متفرق اشعار، جوان کے خراج تحسین پر مشتمل ہیں۔ کلام اقبال کے ترجمے جہاں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے جا چکے ہیں، وہاں شعرائے جموں وکشمیر نے بھی اِس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ بعض شعرا نے اُن کے مبسوط مجموعوں کے ترجمے کئے ہیں جب کہ بعض نے ان کی غزلیات، منظومات اور رباعیات کے مختلف حصوں کا جستہ جستہ ترجمہ کیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے جن شعرا نے کلام اقبال کو کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے، اُن میں ۷۷ء کا سال اقبال صدی تقریبات کے طور پر منایا گیا۔ اس سال اقبال پر کتابوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ ریاست جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے اقبال صدی تقریبات کے موقع پر معروف ادیب محمد امین کامل کی ادارت میں کشمیری شیرازہ کا اقبال نمبر شایع کیا، جس میں اقبال کے منتخب کلام کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اِس موقعے پر اقبال کے فارسی اور اُردو کلام کا کشمیری زبان میں ترجمہ کروایا گیا۔ نیز ''پرتوِ اقبال'' کے نام سے بھی ایک کتاب شایع کی گئی۔ کشمیری کے علاوہ ہندی، ڈوگری اور پنجابی میں بھی ریاستی کلچرل اکیڈمی نے شیرازہ کے اقبال نمبر شایع کئے۔ کشمیر کے ادیب وشاعر غلام قادر اندرابی نے ''بال جبرئیل'' کا کشمیری منظوم ترجمہ کیا جو ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوا۔ اِس کی دوسری اشاعت ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ تاہم بعض لوگوں کو یہ تسامح ہوا ہے کہ یہ کلام اقبال کا پہلا ترجمہ ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اِس سلسلے میں اولیت غلام احمد ناز کولگامی کو حاصل ہے۔ خطۂ کشمیر کے موضع سوپٹ ٹنگہ پورہ، تحصیل کولگام، ضلع اسلام آباد (موجودہ ضلع کولگام) کے مشہور شاعر غلام احمد ناز کولگامی کا اسم گرامی لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اقبال کی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کا کشمیری منظوم ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں اقبال اکادمی پاکستان سے شایع کیا گیا۔

کشمیر میں اقبالیات کو فروغ دینے کے سلسلے میں یہاں کے روزناموں کا بھی رول رہا ہے۔ نیز محکمہ تعلیم ریاستی سطح پر تعلیمی اداروں میں یوم اقبال کی تقریب منعقد کرا رہا ہے۔ اِسطرح اِس صورت حال کے پیش نظر اقبالیات کے خاصے روشن امکانات ہیں۔ ہماری نوجوان نسل نہایت ہی جوش وخروش کے

ساتھ کلام اقبال اور اُس کی تفہیم میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اقبال نے خود کہا تھا۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال پر ریاست جموں وکشمیر میں مختلف زبانوں میں اقبال پر ایک وافر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے بقول پاکستان کے ایک نامور ادیب اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال پر لکھنے والوں کی اتنی زیادہ تعداد ہے جیسے برسات کے موسم میں کینچوؤں اور کھمبیوں کی پالیاں۔ تاہم ایک سنجیدہ اور نہایت اہم موضوع ہونے کے ناتے اقبالیات کا تجزیہ کرنا لازمی ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ اقبالیاتی سرمائے کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں افراط وتفریط کا عمل دخل ہے۔ اور اقبالیات کے تجزیئے کے بعد ہی اس افراط وتفریط کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، تاہم سنجیدہ اقبالیین کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جنہوں نے محنت شاقہ سے کام لیکر اِس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ ان کی تحریروں کو سامنے رکھتے ہوئے اقبالیات کے نہایت خاصے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

تسکینہ فاضل

سرینگر

نومبر ۲۰۱۲

عصری مسائل کا حل فکرِ اقبال کے تناظر میں۔۔بحوالہ کشمیر

پروفیسر مرغوب بانہالی

انسانی زندگی کو عصرِ حاضر میں مختلف قسم کے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن سب کا شمار ممکن نہیں۔ درحقیقت وہ فارسی مقولہ ماضی قریب کے کسی حساس پیش بین اور دُور اندیش قلمکار نے آج کے انسان کا ہی پیشگی تصور کر کے وضع کر رکھا ہے کہ۔ تن ہمہ داغدار شُد پنبہ کُجا کُجا نہم یعنی موجودہ آدم زاد کی خونچکاں زندگی کے انگ انگ پر اتنے زخم لگے ہیں کہ اُن پر مرہم رکھنا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں عائلی مسائل سے عالمی مسائل تک پھیلے ہوئے انتشار کی کیفیت گونا گون سائینسی ایجادات کی بدولت اِنسانی عقل کو ملی ہوئی شاندار پیشرفت پر بھی خندہ زن ہے۔ کیونکہ بحیثیتِ مجموعی انسانی روح کی عدمِ آسودگی جسمانی راحت کی تمام فراوانیوں کا تمسخر اڑا رہی ہے۔

دراصل حیرت افزا ٹیکنالوجی کی میسر کردہ مادی ترقی جس چنگیزیت اور سفاکیت کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے، وہ دانشوری کی ہر سطح کے لئے روح فرسا ہے۔ بیسویں صدی کے سرکردہ مُفکّر اور ترجمان انسانیت شاعر مشرق علامہ اقبال مُستقبل قریب میں پیش آنے والی اِس گھمبیر صورتِ حال کا کتنا پیشگی ادراک رکھتے تھے اور مسائل وضع کرنے والے عناصر کو وہ کس کس انداز میں پہچانتے تھے، اُسکی چند مثالیں مُلاحظہ فرمایئے۔ انفرادی سطح پر جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے مصداق ۔ زیرِ گردوں آدم آدم را خورد، اور اجتماعی سطح پر نمرودیوں، فرعونیوں اور چنگیزیوں کے حوالے سے نہ صرف ملتے بر ملتے دیگر چرد۔ بلکہ یہ رازِ عریاں یا open secret بھی کہ۔ محنت و سرمایہ دُنیا میں صف آرا ہو گئے دیکھیئے ہوتا ہے، کس کس کی تمناؤں کا خون/ حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا و کُنتم بہ تستعجلُون اور اُس پر مستزاد سب سے بڑا یہ اوپن سکرٹ ہے کہ ۔ دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے اسے آزادی کی نیلم پری، یہ وہی مُستقبل شناس مُفکّر ہے جو سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ کہہ کر ایک تازہ انقلاب کا نقیب بھی بنتا ہے لیکن اپنے ہم وطنوں اور ہمزبانوں کو بہت آسان لفظوں میں یہ شعور بھی بخشتا ہے کہ ۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بہر حال دیو استبداد کے اہداف میں فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور عراق و افغانستان کس طرح باری باری سے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اُس ضمن میں جاوید نامہ کے کرداروں کو جاوداں بنانے والا اور بال جبریل کی اُونچی پروازِ تخیل والا شاعر لینن کی رُوح کو خدا کے حضور دُنیا کے بڑے مسائل سے متعلق چند سچائیاں اُگلواتا ہے۔ اُن بڑے مسائل کی واضح نشاندہی اور تفہیم کے لئے درجن بھر اشعار کی نشید ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات
اِک بات اگر مُجھ کو اجازت ہو، تو پوچھوں حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات!
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

بال جبریل کی غزل نمبر ۱۶ میں یہ مضمون یوں بھی پیش کیا گیا ہے کہ۔

گو اِس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

ظاہر ہے کہ اُس وقت خاص فرنگی آقا اِنگلستان تھا اور آجکل امریکہ ہے۔

یُورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہُنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے، یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبُّر یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عُریانی و میخواری و اِفلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مُروّت کو کُچل دیتے ہیں آلات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دُنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

لینن عنوان کی اِس نظم میں شاعر انقلاب کے اس فارسی شعر کی صدائے بازگشت اور کسک بھی صاف

دکھائی دیتی ہے کہ ؎

طرح دگر طراز کن آدمِ پختہ بیار لعبتِ خاک ساختن مے نسزد خدائے را

بلکہ اپنے دور کے علاوہ ہمارے دور کے بیشتر مسائل کی نشاندہی کرنے والے اِن اشعار کی زیریں لہر میں خصوصاً آخری شعر کے پیغام یا اپدیش میں حاوی مسائل کے ممکنہ حل کی جانب بھی کئی بلیغ اِشارے موجود ہیں۔ اِسلئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ جس طرح اِس نظم کے دس شعر میں نے حذف کردئے ہیں اُسی طرح چند اور مسائل کی نشاندہی کرنے والی ارمغانِ حجاز کی ایک نظم کے بیشتر حصوں سے صرف نظر کر کے میں صرف نو شعروں پر مشتمل وہ بند پیش کرتا ہوں جس میں ابلیس اپنے مشیروں کو عالمِ انسانیت میں فسادات برپا کرنے میں حائل اسلام اور اس کے علمبرداروں کی کردار کشی کرنے کی اور اُنہیں آپسی سر پھٹول میں اُلجھائے رکھنے کی سازشیں سُجھاتا ہے۔ شاعرِ مشرق حکیم الامت الاثانی تخلیقی عمل بروئے کار لاکر ابلیس کے مُنہ سے بھی ایسے بلیغ الفاظ اُگلواتے ہیں جو عالمی سطح پر خونچکاں بنائی گئی انسانی بستیوں خصوصاً مسلم بستیوں کی ساری تباہ کاریوں کی ذِمہ دار مغربی تہذیب کو اور اس کے ایجنٹوں یا کارندوں کو قرار دیتے ہیں۔ اِن الفاظ کی تہہ میں بھی مسائل کے حل کی جانب حکیمانہ اشارے موجود ہیں۔ نو میں سے صرف سات شعروں کی نشید پیشِ خدمت ہے، اِبلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے۔

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو کیا زمین، کیا مہر و ماہ کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو
کب ڈرا سکتے ہیں مُجھ کو اشتراکی کُوچہ گرد یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مُجھ کو خطر کوئی تو اُس اُمت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اِس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضُو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے مُزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے !!!

ظاہر ہے جب سے ابلیس کے ایجنٹوں نے اسلام کو فتنۂ فردا قرار دے کر مسلمانوں کو ہر ملک میں مشترکہ ہدفِ ستم بنایا ہے۔ جب سے ہی ابلیسوں اور جدید فرعونوں کے وظیفہ خوار ہر کہیں ظلم و ستم اور قتل عام کے

پچھلے سارے ریکارڈ توڑنے میں مصروف ہیں اور جب سے ہی اقبال جیسے روشن ضمیروں کی وہ ساری دُعائیں مُنتظر اجابت ہیں جوانہوں نے کشمیر جیسے سارے خونچکاں خطوں کے حوالے سے جفاکیش ہاتھوں کوتوڑنے کے لئے مانگی ہیں۔ لیکن سب ہی محکوم اور مظلوم اِنسانوں کو درپیش سفاکانہ مسائل کے پائیدار اور باوقار حل ہم سے اجتماعی دُعاؤں اور فکری یکجہتی کے علاوہ ہم سے مُدافعتی مُشترکہ کاوشوں کے مُتقاضی بھی ہیں۔ یہی بات اقبال نے حکیمانہ رمز و کنایہ سے اُبھارنے میں اپنا زورِ قلم مصرف میں لایا ہے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ گھمبیر مِلّی اور اِنسانی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے ہی شاعرِ مشرق نے فارسی زبان کو اپنا مُفکرانہ ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ وہ اِسی زبان میں اُردو اشعار سے کئی گُنا زیادہ اشعار یادگار چھوڑتے ہیں۔ اختصار سے کام لینے کے لئے میں نشاندہی میں لائے گئے مسائل کا اِمکانی حل بھی علامہ اقبالؔ کے ایک فارسی مکالمہ سے برآمد کرنے کی جسارت کرتا ہوں وہ بھی صرف دو بندوں کے تناظر میں، یہ دونوں بند عالمی آشوب کے حوالے سے زِندہ رُود اقبال اور حضرت شاہِ ھمدان علیہ رحمہ کے درمیان جاوید نامہ میں شامل ایک ہی مُکالمے سے ماخوذ ہیں۔ اقبال کے اِن جامِ جم جیسے فارسی بندوں کے اندر سُمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فنکارانہ عمل بھی پروان چڑھا ہے اور آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی پیش کرنے کے آداب بھی روشن تر بنانے گئے ہیں۔ چنانچہ اقبال کشمیر کے سب سے بڑے معمارِ ثقافت حضرت شاہ ھمدان کے سامنے پچھتر لاکھ روپے میں کشمیریوں کو نیلام کرنیوالے شرمناک بعینامہ امرتسر کا متاسفانہ ذِکر چھیڑ کر نہ صرف اِس خطے کے مظلوموں کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ بلکہ شاہِ ھمدانؒ سے درپیش مسایل کا حل بھی نہایت مودبانہ ڈھنگ سے طلب کرتا ہے اُسی مُودبانہ روئیداد کو ایسے اشعار کا روپ مِلا ہے:۔

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد ملّتے بر ملّتے دیگر چرد !
جاں زِ اہلِ خِطہ سوزد چوں سپند خیزد از دل نالۂ ہائے دردمند
زیرک و درّاک و خوش گلِ ملّتے است در جہاں تردستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست درنئے من نالہ از مضمون اوست
از خودی تا بے نصیب اُفتادہ است در دیار خود غریب افتادہ است

دستِ مزدِ او بدستِ دیگران ماہی رودش بہ شست دیگراں
کاروانہا سوے منزل گام گام کارِ او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے اور بمُرد آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
تانہ پنداری کہ بوداست ایں چنیں جُبہہ راہموارہ سود است ایں چنیں
درزمانے صف شِکن ہم بودہ است چیرہ و جانباز و پُر دم بودہ است

عُمر ہا گل رخت بربست و کُشاد خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد
دہقان و کِشت وجوے و خیاباں فروختند قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

فارسی نہ جاننے والے دوستوں کے لئے اِن درجن بھر شعروں کا اُردو ترجمہ بھی درج کیا جاتا ہے تاکہ اِن تاثرات کو سمجھنے کے بعد اِن کے جواب میں حضرت شاہ ھمدانؒ کی طرف سے مرحمت ہونے والے جامع اور بلیغ اِشاروں کو سمجھنا خصوصاً عالمی سطح پر درپیش مسائل کے حل کی تجاویز کو سمجھنا بھی آسان بن جائے۔

ترجمہ یہ ہے۔

''کھلے آسمان کے نیچے (ہمارے دور میں) ایک آدمی دوسرے آدمی کا خُون پینے اور اس کا مال کھانے میں آزاد ہے۔ اور ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ خطۂ کشمیر کے حالات دیکھ کر میرا دل ایک دانۂ اِسپند کی طرح جلتے ہوئے نالہ زن ہے اور میرے دل سے یہاں کے حالات دیکھ کر ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے۔ زیرکی، معاملہ فہمی اور خوش خُلقی کے لئے معروف رہی ہوئی کشمیری قوم آج ساری دُنیا میں محتاجی اور پامالی کی ایک مِثال بنی ہوئی ہے۔ اِس قوم کا جام اِسی کے خُون میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ میری بانسری اِسی قوم کی حالتِ زار کا راگ الاپ رہی ہے۔ جس دِن سے یہ قوم خُودی سے بیگانہ ہوگئی ہے اُسی دن سے یہ قوم اپنے دیس میں پردیسی بن کر اپنی آمدن کے خداداد وسائل تک اغیار کو سونپتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دریاؤں کی مچھلیاں تک اغیار کے جالوں کو مالا مال کر رہی ہیں۔ یوں تو ہر کسی قوم کا کاروان اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑی ہوشیاری سے گامزن ہے لیکن اس کے کاروان کا کام (عدم اتحاد اور عدم یکجہتی کے اعتبار سے) خام اور ناکام ہے۔ غلامی کے اثر سے اس قوم کے صالح جذبوں پر بھی مُردنی سی

چھا گئی ہے۔ جیسے اسکی انگور کی بیلوں میں سے دو آتشہ کی آگ ہی بُجھ گئی ہو۔ لیکن حضور والا آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ قوم ہمیشہ ایسی ہی زبوں حال اور سرنگوں رہی ہو گی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب یہ لوگ جابروں اور غاصبوں کے مقابلے میں سخت کوش جانباز اور نا قابل شکست بن کر بڑی پُر وقار اور خود کفیل زندگی گذار رہے تھے۔۔۔ اِس باغ میں اگر چہ تب سے بہت سے پھُول کھلتے اور مُرجھاتے رہے لیکن سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اِس بستی کو تب سے ایک اصول پر چٹان کی طرح قایم رہنے والا سلطان شہاب الدین جیسا دوسرا کوئی رہنما نصیب نہ ہو سکا ہے۔۔۔ اقبال اس روئیداد کا اختتامیہ جس شعر کو بناتا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانیت کُش بیعنامہ امرتسر کی رُو سے کشمیر کے کسان کی کھیتی، اُس کے آبی وسایل کا ماحصل اور اُس کے درختوں کا میوہ تک سستے داموں نیلام ہوتا رہا ہے۔

اِن تاریخی حقائق کا فنکارانہ اظہار کرنے کے بعد اقبال کا تخلیقی عمل حضرت شاہ ھمدانؒ سے جو روشنی حاصل کرتا ہے اُس میں خصوصیت کے ساتھ جسم اور روح کے حوالے سے مادہ پرستانہ خرمستیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور روحانی تقاضوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اُن کی طرف اِشارہ کرنے سے پہلے یہ بات بھی ملحوظ رکھنی پڑے گی کہ اقبال اِنسانیت کے درپیش مسایل کا حل تین سطحوں پر تجویز کرتے ہیں۔ پہلی سطح اخلاقی سدھار اور کردار کی تعمیر سے متعلق ہے جس میں ہر اہلِ ایمان فرد کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اصلاحِ احوال کا مکلف بنایا گیا ہے، یعنی یا ایھاالّذین امنو قُوا اَنفُسَکُم و اَھلِیکُم نارا جیسی آیتِ کریمہ اور کُلّکُم راعٍ و کُلّکُم مَسئولٌ عَن رَعیَتِہٖ جیسے حدیثِ مبارک پر عمل کرنے کی تحریک دی گئی ہے اس ضمن میں خاص طور پر خواتین کو ماؤں اور بہنوں کی حیثیت سے جس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا ہے اُس کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

زِشام مابروں آور سحر را بہ قرآن باز خواں اہلِ نظر را
تو میدانی کہ سوزِ قرات تو دِگر گوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

گویا قرآن حکیم ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس پر عمل کرنے والا اپنی سطح پر انفرادی امراض کا علاج کرنے میں بھی اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے اور اجتماعی امراض کا علاج کرنے میں بھی۔ بشرطیکہ وہ عربی دانی اور تفہیم معانی سے اہلِ خانہ کو آراستہ کر سکے، دوسری سطح چینلوں کے ذریعے ہونے والے روز افزوں تہذیبی یلغار کے مقابلے میں رول ماڈل کے طور پر سماجی اور سیاسی تدبر سکھانے والے انسانِ کامل اور اللہ کے آخری رسول ؐ کی مکمل

پیروی کا شعور بیدار کرنا ہے۔ اِسی تناظر میں کہا گیا ہے کہ

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

تیسری سطح خالصتاً سیاسی طاغوت کا توڑ کرنے کے لئے جنیوا کے بدلے کسی اور مقام کو اقوام خصوصاً مظلوم اور مقہور اقوام کے لئے منتخب کرنے میں اپنا حصہ خلوص اور ایثار کے ساتھ ادا کرنے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ ایسی تمام فریادیں بے اثر ثابت ہوگئی ہیں جو ایسے الفاظ کا روپ دھارتی رہی ہیں کہ ؎

بادصبا اگر بہ جنیوا گذر کنی حرفے زِما بہ مجلسِ اقوام باز گوے

اِس سلسلے میں اقبال زندہ رود کو جو ارشاد اپنے تخیلی سفر کے آخری پڑاو پر حضرت شاہ ھمدانؒ نے عنایت فرمایا ہے وہ ایسے اشعار پر مشتمل ہے۔

باتو گویم رمزِ باریک اے پسر تن ہمہ خاک است و جان والا گہر
جسم را ازبہر تن باید گداخت پاک را از خاک مے باید شناخت
گر بیّری پارۂ تن راز تن رفت از دست تو آں لختِ بدن
لیکن آں جانے کہ گردد جلوہ مست گر زدست او را دہی ، آید بدست
جوہرش با ہیچ شے مانند نیست ہست اندر بندو اندر بند نیست

اِس مختصر مقالے کا اختتامیہ ان فارسی اشعار کے اردو ترجمے کو بنانا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ جو یوں ہے، پیارے بیٹے! میں تمہیں ایک نازک بات کی آگاہی یہ کہہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر آدمی کا جسم خاکی اور فانی ہے لیکن ہر ایک رُوح ایک خاص جوہر اور لافانی چیز سے عبارت ہے۔ (درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے) اور اِس جوہر کو پروان چڑھانے کے لئے قوای جسمانی کی بہترین تربیت کرتے ہوئے جسم کو پگھلانا لازمی ہے۔ مادی ترجیحات کے بجائے روحانی ترجیحات کی اولیت کو سمجھنا ہے۔ وہی اس خاکدان میں پوشیدہ رکھے گئے جوہر کی معرفت کا تقاضا ہے۔ اگر تُم جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر الگ کردو گے تو تم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جاؤ گے۔ البتہ اگر تُم اپنی روح کو حقیقتِ اعلیٰ کی معرفت سے جلوہ مست یا مخمور و مسرور ہونے کی کیفیت سے ہمکنار کر پاؤ گے تو وہ رُوح تُم سے الگ ہو کر بھی تُم سے الگ نہ ہوگی۔ بلکہ تم ہی

دوسروں کو راستہ دکھانے والے بن سکو گے۔ گویا رُوح کا جوہر جسم کے قویٰ کی مانند نہیں بلکہ خاص الوہی پر پرواز کا حامل ہے جو قید میں ہو کر بھی قید سے آزاد رہنے کی فضیلت والا جوہر بن کر چمکتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ۔ مطالعے کی نئی جہات

پروفیسر ظہور الدین

اِس نظم کو پڑھتے اب ایک عمر ہو چلی ہے۔ کبھی اس کو خود طالبِ علم کی حیثیت سے پڑھا، کبھی اساتذہ نے پڑھوایا اور کبھی خود استاد کی حیثیت سے اسے دیکھا، ہر بار کوئی نہ کوئی نئی گتھی سر اُبھارتی رہی جسے کھولنے کے لیے جتنی کوشش کی وہ اُتنی ہی اُلجھتی چلی گئی۔ فہم و ادراک کے سبھی ناخن لہولہان ہوتے رہے۔ جدید دور کی نئی تھیوریز کی روشنی میں بھی اِسے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے، پر ہر بار یہ احساس ہوتا رہا کہ نظم میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو گرفت میں نہیں آ پا رہی۔ ہر مطالعے میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور محسوس ہوتی رہی۔ البتہ اِن ناکامیوں نے یہ شعور ضرور عطا کیا کہ اِس نظم کے مفہوم تک پہنچنے کے لیے نہ صرف کلاسیکی تعبیری حربوں کو برتنا ضروری ہے بلکہ اُن نئے تعبیراتی ٹولز سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے جنھوں نے روایت سے قطعی انحراف کرتے ہوئے صرف متن سے ہی سروکار رکھنے کی کوشش کی ہے اور جو متن کو قائم بالذات تصور کرتے ہوئے اُس کی تفہیم کے لیے کسی بیرونی سہارے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ میرا خیال ہے یہ بھی اُسی طرح کی انتہا پسندی ہے جس طرح کی انتہا پسندی نے اشتراکیوں یا پھر دوسرے نظریات پر یقین رکھنے والوں کے ہاتھوں ادب کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ جس طرح ہماری کائنات کی ہر شے دوسری اشیا سے کسی نہ کسی رشتے میں بندھی ہوئی ہے اِسی طرح ادب بھی حیات و کائنات کی اِس طویل و لامتناہی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ زنجیر کا ہر حلقہ جس طرح اپنے ماقبل اور مابعد سے جڑا ہوتا ہے اِسی طرح ادب بھی اپنے ماضی و حال و مستقبل سے ایک ناقابلِ تنسیخ رشتے میں بندھا رہتا ہے۔ اُس کی صحیح تفہیم اِن سبھی رشتوں سے ابھرنے والے شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ اِس لیے ضروری ہے کہ نئے و پرانے سبھی ٹولز کے متوازن اِستعمال سے ایک ایسا سانچہ تیار کیا جائے جو زیرِ نظر ادب یا فن پارے سے مناسبت رکھتا ہو۔

اِس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر ادب یا فن پارے کو سمجھنے کے لیے ضروری نہیں کہ پہلے سے موجود سانچے مناسب ہی ثابت ہوں۔ پہلے سے موجود سانچوں سے مدد تو ضرور لی جا سکتی ہے لیکن درست تفہیم کے مرحلے اُسی صورت میں طے ہوتے ہیں جب تفہیم کا وہ سانچہ تیار ہو جو متعلقہ ادب یا

فن پارے کے لیے مناسب ہے۔ اِس لیے پہلے سے موجود سانچوں کو جوں کا توں قبول کر کے کسی ادب یا فن پارے پر منطبق کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ عمل تفہیم کے در وا نہیں بند کر دیتا ہے جو روشنی کی بجائے اندھیرا، بصیرت کی بجائے کور ذوقی عام کرنے کا موجب بنتا ہے۔

آیئے اب آگے بڑھنے سے پیشتر یہ بھی جاننے کی کوشش کریں کہ ہمارے جدید ترین لسانی یا متنی مطالعے نقاد یا طالبِ علم سے کس طرح کے تعمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ متنی مطالعہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا فن پارے یا متن کو قائم بالذات تصور کرتے ہوئے اُسے اُن تمام حوالوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کو کلاسکی تنقید متن کی صحیح تفہیم کے لیے ضروری قرار دیتی ہے۔ یعنی کلاسیکی تنقید کے اصولوں کے مطابق جہاں مسجد قرطبہ کی درست تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ناقد نہ صرف اُس سیاسی، سماجی، نجی و نفسیاتی یہاں تک کہ تاریخی و ماحولیاتی صورت حال سے آشنا ہو جس نے کسی متن کی تخلیق کے لیے بنیادی محرک کا کام کیا بلکہ اُن مقاصد تک بھی رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے جن کی بار آوری کے لیے متن کو تخلیق کیا گیا۔ وہاں منطقی مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف یا فن کار کو نہ صرف متن سے بے دخل کر کے اُسے پڑھنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ بھی تصور کر لیا جائے کہ متن تخلیق کرنے کے بعد فن کار کا انتقال ہو چکا ہے (بارت) یعنی اِس دلیل کے مطابق اگر ہمیں ''مسجد قرطبہ'' کو درست طور پر سمجھنا ہے تو سب سے پہلے نہ صرف اُس عمارت کے تاریخی و تہذیبی حوالوں سے صرف نظر کرنا ہوگا بلکہ اِس بات کو بھی بھلانا ہوگا کہ زیرِ نظر نظم علامہ اقبالؔ نے اُس وقت تخلیق کی جب وہ ہسپانیہ کی سرزمین پر بلکہ قرطبہ کے مقام پر موجود تھے۔ یہ بھی فراموش کرنا ہوگا کہ اُسے علامہ اقبالؔ نے تخلیق کیا ہے یا اُن کا کوئی بھی رشتہ ''مسجد قرطبہ'' سے ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِن سبھی حوالوں سے الگ رہتے ہوئے زیرِ نظر نظم کو سمجھا یا اُس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو اِس نظم کے عنوان کو پڑھتے ہی قاری یا ناقد کے ذہن میں یہ سوال اُبھر آتا ہے کہ ''مسجد قرطبہ'' کہاں واقع ہے اور اُس میں ایسی کون سی خصوصیت ہے جس نے اقبالؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر کو اُس پر اتنی خوبصورت نظم تخلیق کرنے کی تحریک دی۔ اِن سوالات کے ابھرتے ہی نظم کے وہ سارے حوالے زندہ ہو جاتے ہیں جن کو فراموش یا نظر انداز کرنے کا تقاضا متنی مطالعہ کرتا ہے۔ اِس بات کو کس طرح فراموش کیا جا سکتا ہے کہ ''مسجدِ قرطبہ'' مسلمانوں کے شاندار ماضی کا علامیہ ہے۔ اِس عنوان کو پڑھتے ہی اہل اسلام کے

اُس شاندار دور کی پوری تاریخ ایک زندہ حقیقت کی طرح قاری کے ذہن و دل کو منور کرتی چلی جاتی ہے۔ عنوان سے آگے بڑھتے ہوئے جب ہم نظم کے پہلے ہی شعر سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات۔ سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات، کی قرأت کرتے ہیں تو ایک اور اہم اور پیچیدہ سوال ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کس کی آواز ہے؟ کون ہے جو ہمیں نہ صرف وقت کی بے پناہ تباہ کن قوت کا احساس دلا رہا ہے بلکہ اُسے حیات و ممات کی اصل بھی قرار دے رہا ہے۔ کلاسیکی تنقید جہاں ہمارے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ کہے گی کہ یہ مصنف کی آواز ہے وہاں متن، جو مطالعہ اسے متن کی آواز قرار دیتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کرے گا کہ ہم سے یا قاری و نقاد سے کوئی اور نہیں متن ہم کلام ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کرے گا یا ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ متن کی تخلیق ایک خود کار عمل ہے اُسے جنم دینے والا کوئی نہیں وہ آپ ہی آپ اپنی کوکھ سے ابھرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اِس بات کو اگر دم بھر کے لیے تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر ایک اور پیچیدہ سوال ہمیں اپنی گرفت میں لے لے گا اور وہ یہ کہ اگر ایسا ہے تو پھر یہ کیوں ہے کہ وہ اپنے اظہار کے لیے وہی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہے جو اُس ماحول میں بولی جا رہی ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ الہامی صحیفوں کے پاس تو اس کا جواب موجود ہے چوں کہ وہ کسی نہ کسی انسان پر اترتے ہیں اِس لئے اُسی انسان اور اُس کے ماحول سے متعلق زبان میں اتارے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو جب اِس بات سے ہی اِنکار کیا جا رہا ہے کہ متن کا اُس کے مصنف کے ساتھ کوئی رشتہ ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ ایک مخصوص زبان برتنے پر مجبور ہے۔ ایک مخصوص زبان کا استعمال اور کچھ نہیں اِتنا تو ثابت کرتا ہی ہے کہ اِس کا نزول کسی ایسے وجود پر ہوا ہے جو وہ زبان بولتا ہے جس میں متن ہے۔

کچھ دیر کے لیے اگر ہم درج بالا دلیل کو فراموش کر کے یہ تسلیم کر لیں کہ متن کا مصنف اُس وقت تو زندہ تھا جب متن تخلیق ہوا لیکن اُس کے فوراً بعد وہ فوت ہو گیا۔ یعنی اب وہ متن میں موجود نہیں۔ اس صورت میں تو مصنف کو متن سے بے دخل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اولاد اس بات کا اعلان نہیں کر سکتی کہ اُن کی رگوں میں کسی کا خون نہیں دوڑ رہا ہے۔ باپ کے انتقال کے بھی اولاد کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے مصنف اگر متن تخلیق کرنے کے بعد فوت بھی ہو جاتا ہے یا اُسے

بے دخل بھی کر دیا جاتا ہے (جو قانوناً ممکن نہیں) جب بھی متن میں اُبھرنے والی آواز اُسی سے منسوب ہو گی۔ ہم اقبال کو اِس نظم کے چوکھٹے سے باہر کر ہی نہیں سکتے۔ ہمیں یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اقبال مسجد قرطبہ کی عمارت کے جاہ وجلال سے اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ عالم اِسلام کی پوری تاریخ مجسم صورت میں اُن کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ سارے کارہائے نمایاں زندہ تجسیم کی صورت میں اُنھیں اِس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وقت اگر چہ حادثات کو جنم دینے، اشیا کی صورتیں بگاڑنے اور بنانے، حیات وموت اگر چہ اُسی کے رچائے کھیل ہیں، وقت ہی وہ تارِ حریرِ دو رنگ تیار کرتا ہے جس سے ذات کو قبائے صفات میسر آتی ہے۔ اِسی کی وجہ سے سازِ ازل سے وہ نغمے پھوٹتے ہیں جس سے ذات ممکنات کے زیر و بم دکھاتی ہے۔ وقت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر شے کسی جاتی ہے اور اُس کے کھوٹے کھرے ہونے کا پتا چلتا ہے۔ یہی سلسلۂ روز وشب صیرفیٔ کائنات ہے۔ یہ ہر شے کو پرکھتا ہے اُس کا امتحان لے کر اُس کے جوہر کو صیقل کرتا ہے جو حیات جاوداں کی ضمانت بنتا ہے۔ اِس کائنات کی جو شے اِس کسوٹی پر کھری اترتی ہے وہ زندہ رہتی ہے جو کھوٹی ثابت ہوتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

اِس ابتدائی بند کا پانچواں شعر ؎

''تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات''

یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ یہاں شاعر ہی اپنے قاری سے مخاطب ہے نہ کہ متن۔ موت کی اہمیت زندگی کے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اُس کے جبر کا صحیح اندازہ زندگی سے تقابل کے دوران ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ آواز متن کی ہوتی اور ہم یہ تسلیم کر لیتے کہ یہاں مصنف نہیں متن اپنے قاری سے مخاطب ہے تو وقت کی بے پناہ قوت کا نقش شاید اُتنا متاثر نہ کرتا جتنا قاری سے شاعر کے تخاطب نے اُسے متاثر کن بنا دیا ہے کیونکہ یہ بات تو افلاطون نے ہمیں بہت پہلے بتا دی ہے کہ بولا ہوا لفظ لکھے ہوئے لفظ سے ہمیشہ برتر ہوتا ہے۔ متن جو خود کم تر وجود کا حامل ہے اُس کی آواز میں وہ جادوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا جو اِس بند میں محسوس ہوتا ہے۔ اقبال جس حقیقت کو ابھارنا چاہتے ہیں اُس کے لیے ایک بُلند مرتبت خطابیہ لہجے کی ضرورت ہے کیونکہ بولے جانے والے لفظ کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ اقبال اِس حقیقت سے آشنا ہیں اسی لیے وہ ایسے الفاظ

کا سہارا لیتے ہیں جو گفتگو کی شان رکھتے ہیں جن میں وہ ڈرامائی عنصر موجود ہے جو گفتگو کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ پورے بند پر زندگی کی بے ثباتی اور وقت کی جبریت مسلط ہونے کے باوجود جوش و ولولے کی ایک کیفیت موجود رہتی ہے جس کو ایک عام قاری موضوع اور جذبے کے درمیان حسی تضاد قرار دے کر فنی خامی کا نام دے سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بُعد یا تضاد خامی نہیں خوبی ہے کہ یہی تضاد وقت اور زندگی کی حقیقت کو موثر بنانے کا کام کرتا ہے۔ جس طرح دن کی اہمیت کا پتا ہمیں رات کی موجودگی سے ہوتا ہے اسی طرح اِس بند میں زندگی اور کائنات کی بے ثباتی کو فکر کی ولولہ انگیزی سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر اُس رَجائی احساس کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہو جو تاریک سے تاریک ترین حقائق کی کوکھ میں موجود کسی مثبت حقیقت کے گرفت میں آجانے سے انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اِس صورتِ حال میں بظاہر بیان پر قُنوطیت مُسلط نظر آتی ہے لیکن بہ باطن گہری رجائیت راج کرتی ہے۔

ہیئتی اور لسانی اعتبار سے اقبالؔ اِس نظم کے لیے نہ صرف ایک رواں بحر کا انتخاب کرتے ہیں بلکہ فکر کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کے لیے جن الفاظ و تراکیب کو استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف مُترنّم بلکہ موثر پیکریت کی حامل بھی ہیں۔ ہر شعر بہت ہی خوبصورت تصویروں کا ایک سلسلہ بن کر قاری کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے۔ سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات، تارِ حریرِ دو رنگ، حیات و ممات، قبائے صفات، سازِ ازل کی فغاں، زیر و بمِ ممکنات، صیرفیٔ کائنات یہ وہ تصویریں ہیں جو قاری کے ذہن و دل میں ایک کھنک سی پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اور یہ سننے کے بعد بھی کہ ''آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر۔ کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات یا اول و آخرِ فنا، باطن و ظاہرِ فنا، نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا''، قاری مایوس نہیں ہوتا ایک عجیب طرح کی رَجائی کیفیت سے سرشار نظر آتا ہے۔ علم نشانیات (سایؔور) کی زبان میں اگر یہ کہا جائے کہ ہر مصرع ایک دوسرے سے منسلک نشانات کا ایک ایسا سلسلہ ہے کہ ہر نشان دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نظر آتا ہے۔ کسی ایک نشان یا لفظ کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں یہ نشانات ویسے نہیں ہیں جیسے ٹریفک کے نظام کو چلانے کے لیے سڑک کے کناروں پر لگے نظر آتے ہیں۔ یہاں یعنی ادب میں نشانات معنی کے اعتبار سے اِس حد تک قطعیت کے حامل نہیں ہوتے۔ یہ

نشانات معنی کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں۔ اب یہ قاری یا ناقد کا منصب ہے کہ وہ اُن کے ممکنہ اَبعاد کو روشن کرتا چلا جائے لیکن من مانے انداز میں نہیں بلکہ نشانات کی قیادت میں جنھیں عام زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ نشانات اُن مفاہیم کی طرف ترغیب ضرور دینا چاہیں۔ مثلاً اِس نظم کے دوسرے بند کو پڑھنے کے بعد مجموعی اعتبار سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اِس میں اقبالؔ تخصیص کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ یعنی پہلے بند میں حیات و کائنات کے تمام مظاہر کے بارے میں ایک عمومی حقیقت کا ذکر کرنے کے بعد اب اپنے بنیادی موضوع کی طرف لوٹ رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وقت یا زمانے کی تباہ کن فطرت کے باوجود، جس کی دست بُرد سے اِس کائنات کی کوئی شے محفوظ نہیں ہے، ایک طاقت ایسی ضرور ہے جو اسے ہلا سکتی ہے اور وہ طاقت ہے مردِ خدا کا عمل۔ وہ نقش لازوال ہو جاتا ہے جس کو کسی مردِ خدا نے مکمل کیا ہو۔ لیکن مردِ خدا میں یہ طاقت یا ہنر کہاں سے آتا ہے۔ عشق کی اُس چنگاری سے جو خدا اور رسولؐ کے تئیں اُس کی محبت کو اُس کے وجود کے اندر ہمہ وقت سُلگائے رکھتی ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں ''ہے مگر اُس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام/ مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ، عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام''۔ مردِ خدا کے ہاتھ میں وہ جادو ہے جو مٹی کو سونا بنا دیتا ہے۔ اِن مصرعوں میں جتنے گہرے یا مرکب نشانات برتے گئے ہیں مثلاً رنگِ ثبات، دوام، مردِ خدا، تمام، عمل، عشق، صاحب فروغ، اصل حیات، موت، حرام ان کے جو سامنے کے معنے ہیں وہ یہاں مراد نہیں ہیں۔ یہ سڑک پر لگے بھاگتے ہوئے بچے کے نقش کی طرح قطعی معنے دینے کے لیے نہیں برتے گئے۔ بھاگتے ہوئے بچے کی تصویر کو دیکھتے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آس پاس کوئی اسکول ہے اِس لیے یہاں گاڑیوں کی رفتار کم ہو جانا چاہیے۔ کسی ادبی فن پارے میں یہ نشانات اس طرح کے قطعی معنوں کی ترسیل کے لیے نہیں برتے جاتے معنوی جہتوں کو کھلا رہنے دیا جاتا ہے تاکہ قاری کی ذہانت کا امتحان ہو سکے۔ اِس لیے یہاں بھی اِن نشانات کے گرد معنوں کا اِک جال سا بنا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں اقبالؔ دراصل انسان کو معجزے انجام دینے کا ہنر سکھانا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حیات و کائنات کی تشکیل قدرت نے ہر شے کو محض فنا کی منزل تک پہنچانے کے لیے نہیں کی بلکہ اِنسان کے ہاتھوں اُسے حیاتِ جاوداں عطا کرنے کے لیے کی ہے۔ انسان کی تخلیق صرف مرنے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ اپنے عمل سے موت کو شکست دینے کے لیے کی گئی ہے لیکن

شرط یہ ہے کہ اُس کا عمل عشق خدا اور رسول کی چنگاری سے صاحب فروغ ہو ___ وقت کا دھارا اگر چہ بہت تیز رفتار سے بہتا ہے اور ہر اُس شے کو بہا لے جاتا ہے جو اُس کی زد میں آتی ہے لیکن وہ عشق کے سیل سے یہ نہیں کر سکتا۔ ''عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام''۔ یہ پورا مصرع ایک طویل پیکر ہے۔ تصور کی آنکھ کے سامنے ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دو طوفانی دھارے ایک دوسرے سے متصادم ہو کر وقت یا زمانے کی تباہ کن قوت کو روک رہے ہوں۔ بند کے باقی اشعار میں عشق کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے وہ استعارے برتے گئے ہیں کہ اُن سے بہتر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ عشق کی عظمت کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ وہ لازوال ہے۔ اُسے حیات دوام حاصل ہے۔ اسی لیے اُس کی تقویم میں سارے زمانے مقید ہیں۔ وہاں وقت کی تقسیم کا کوئی پیمانہ راس نہیں آ سکتا کیوں کہ وہ نا قابل تقسیم ہے۔ اُس کی عظمت کا دوسرا ثبوت یہ کہ وہ نہ صرف دم جبرئیل بلکہ دلِ مصطفیٰؐ بھی ہے۔ یہ دونوں استعارے عشق کے تقدس کو بدرجہا بڑھا دیتے ہیں۔ پاکی اور تقدیس کی مثال اِن دو عظیم ناموں سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے، پھر ان ناموں کو مصرع کی ترتیب میں ایسی جگہوں پر استعمال کیا ہے کہ اُس کی روانی میں طوفان کی سی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ لفظ یا نشان کو صحیح نشست ملے تو اُس کی تاثیر دو دھاری تلوار کا کام کرتی ہے۔ ذرا اِن مصرعوں کو پڑھیے جمالیاتی کیف و کم تو اپنی لپیٹ میں لیتا ہی ہے۔ صوتی دھارا اپنے آہنگ میں ہر شے کو بہائے چلا جاتا ہے۔ ''عشق دم جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ/عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام/عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام/عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود۔ عشق ہے ابن السبیل، اُس کے ہزاروں مقام''۔ اور پھر بند کا آخری شعر تو تصویروں کا ایک ہجوم ہے۔ ''عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات،'' عشق کا مضراب، نغمۂ تارِ حیات، نورِ حیات، نارِ حیات، کتنی تصویریں ہیں جو عشق کی جامعیت کو ہمارے وجود پر مسلط کر دیتی ہیں۔ صرف انسان کے خدا سے عشق کی بات نہیں ہو رہی انسان سے خدا کے عشق کو بھی پیش کیا جا رہا ہے یہ بات نہ ہوتی تو یہ کائنات ہی نہیں انسان کی تخلیق بھی ممکن نہ ہوتی۔

تیسرے بند میں اقبال اب براہِ راست مسجد قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور اُسے عشق کے ہاتھوں تخلیق یا فن کاری کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہوئے نہ صرف تخلیق کے بارے میں اپنے نظریات سے ہمیں روشناس کرتے ہیں بلکہ ایک مکمل فن پارے کو دیکھ کر ناظر پر جو جمالیاتی کیفیت طاری ہوتی ہے اُسے

خوبصورت استعاروں کی مدد سے پیش کر دیتے ہیں۔ اِس کیفیت کے بیان میں ذاتی تجربے کی آنچ نے صداقت کا جو جوہر پیدا کر دیا ہے وہ اقبالؔ کے ہر لفظ سے ٹپکا پڑتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود، عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود/ رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت، معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود/ قطرۂ خونِ جگر سلِ کو بناتا ہے دل خونِ جگر سے صدا سوز و سُرور و سُرود!/ تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز، تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود۔ پھر سینۂ آدم کو عرش معلیٰ کا ہم زاد قرار دیتے ہوئے اُس کی عظمت کا ترانہ چھیڑتے ہیں۔ اور اُسے فرشتوں سے برتر اِس لیے قرار دیتے ہیں کہ اُن کے سجدوں میں وہ گداز نہیں جو انسان کے سجدوں میں ہے۔ وہ خاکی ہونے کے باوجود اپنے عشق کی آنچ سے غیر ذی روح اشیا میں روح پھونک دیتا ہے۔ آخر میں اقبالؔ اپنی شاعری کو بھی عشق اِلٰہی کی آنچ کی دین قرار دیتے ہوئے در پردہ اُس کی بھی دوامیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ''کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و دُرود، لب پہ صلوٰۃ و درود/ شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے، نغمۂ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے''۔ لسانی طرفگی کا جو سفر پہلے بند سے شروع ہوا تھا اُس میں ذرا سی کمی بھی واقع نہیں ہوتی۔ وہی لسانی طنطنہ یہاں بھی برقرار رہتا ہے۔ روانی کا وہی عالم لے کا زیر و بم وہی، موسیقیت کا وہی عالم ہر شے گنگناتی سی محسوس ہوتی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ موسیقیت کا یہ جادو موضوع کی اہمیت کو دھندلا نہیں کرتا بلکہ اُس کی تیزی و کاٹ میں بدرجہا اضافہ کر دیتا ہے۔ تاثر، تحریک کو جلا دیتا ہے، قاری کو سلاتا نہیں بیدار کر کے فکر کے ہفت خوان طے کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

اگلے (چوتھے) بند میں ایک بار پھر شاعر مسجد قرطبہ کے جاہ و جلال کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس طرح کی پرشکوہ عمارت مردِ خدا ایسے ہنر مند اشخاص کے کرشمہ خیز ہاتھوں کی ہی بنائی ہوئی ہو سکتی ہے۔ اُن کی طرح ہی وہ بھی جلیل و جمیل ہے۔۔ بنیاد کی پاسداری اور ستونوں کی کثرت کو پیش کرنے کے لیے جو تشبیہ اقبال برتتے ہیں وہ نادر ہی نہیں بہت مناسب بھی ہے۔ ''تیری بنا پائدار، تیرے ستون بے شمار، شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل''۔ ستونوں کی کثرت کو شام کے نخلستانوں میں استادہ کھجور کے درختوں سے مشابہ قرار دینا ذاتی تجربے کی وسعت کا علامیہ ہے۔ اس طرح کی تشبیہ کو علم نشانیات میں اشاریاتی تشبیہ قرار دیا جاتا ہے جیسے آگ کو اگر پیش کرنا مقصود ہو تو دھوئیں کو اٹھتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ اقبالؔ

اکثر ایسے نشان استعمال کرتے ہیں جن کے مابین کوئی نہ کوئی تصویری یا فکری مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ وہ علامتی نشانات نہیں ہوتے جن کے معنی اور معنی نما یعنی تشبیہہ اور مشبہ بہہ کے درمیان کوئی نہ کوئی تصویری یا معنویاتی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ من مانے علائم کے زمرے میں نہیں آتے۔ اس طرح کی تشبیہوں یا استعاروں کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کے اِبلاغیاتی مرحلوں کو آسان بنا دیتے ہیں۔

مسجد قرطبہ کی تعمیراتی خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد اقبالؔ اُس کے معماروں یعنی مسلمانوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مسجد قرطبہ تجھے دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ تجھے بنانے والے بھی تیری ہی طرح لازوال ہیں۔ اُن کو وقت کا کوئی ریلا مٹا نہیں سکتا کیونکہ اُن کے سینے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات سے منور ہیں۔ اُن کا گھر کوئی ایک خطۂ زمین نہیں بلکہ ساری زمین اُن کا گھر ہے اس لیے اُنھیں مٹانا آسان نہیں۔ اُنھوں نے ہر جگہ اپنے کارہائے نمایاں کے نشانات ثبت کیے ہیں۔ اللہ چوں کہ اُن کا محافظ ہے اس لیے اُن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

اقبالؔ اس بند میں مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر کر کے اُنھیں تحریک دے رہے ہیں کہ وہ موجودہ دورِ زوال سے خود کو آزاد کر کے ایک بار پھر عُروج کی اُنھیں وادیوں تک پہنچیں جو کبھی اُن کا مسکن تھیں۔ اپنے اس پیغام کو موثر بنانے کے لیے اقبال ایسا پُرشکوہ پیرایۂ بیان استعمال کرتے ہیں جس کو کلاسیکی زبان میں Rhetorics یعنی خطابیہ لب و لہجہ اور جدید زبان میں معروضی و موضوعی تشابہہ قرار دیتے ہیں۔ خطابیہ لب و لہجے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ خیال، محسوسات کی دھنک بھی ساتھ لیے پھرتا ہے۔ بولا گیا لفظ یہاں محض کسی مفہوم کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اُس جذبے کی آنچ بھی لیے ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ بولا جاتا ہے۔ چناں چہ ضروری ہے ایسے بولوں کے لیے ویسے ہی الفاظ برتے جائیں جو مفہوم کے ساتھ ساتھ اُن جذبوں کو بھی آشکار کریں جن کے ساتھ اُس نے اظہار پایا ہے۔ بولے گئے لفظ اور سوچے گئے لفظ کے فرق کو اگر شاعر نہیں جانتا تو وہ شاعری کر ہی نہیں سکتا۔ اقبال چوں کہ اِس فن سے آشنا ہیں اس لیے دیکھیے اِس بند میں استعمال کیا گیا ہر لفظ، محاورہ یا استعارہ ایک کھنکتے ہوئے برتن کی طرح جھنجھناتا محسوس ہوتا ہے۔: مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے، اُس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیمؑ و خلیلؑ/

اُس کی زمین بے حدود، اُس کا افق بے ثُغور، اُس کے سمندر کی موج، دجلہ و دینوب و نیل/ اُس کے زمانے عجیب، اُس کے فسانے غریب۔ عہدِ کہن کو دیا اُس نے پیام رَحیل/ ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق۔ بادہ ہے اُس کا رحیق، تیغ ہے اُس کی اصیل/ مرد سپاہی ہے وہ، اُس کی ذرہ 'لا الٰہ'، سایۂ شمشیر میں اُس کی پنہ 'لا الٰہ'۔

پچھلے بند میں مردِ مسلماں کے عنوان سے جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا تھا اب اگلے بند میں اقبالؔ تفصیل سے اُن کو مزید بیان کرتے ہیں۔ اُسی مردِ مسلماں کو اب وہ بندۂ مومن، بندۂ مولا صفات اور مردِ خدا کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ بند کا ہر شعر اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اتارتا چلا جاتا ہے۔ بندۂ مومن کیا ہوتا ہے اس کا پتہ اقبال کو مسجدِ قرطبہ دیکھ کر چلتا ہے۔ اُس کے دن رات عشقِ الٰہی کی آگ میں تپتے ہوئے کٹتے ہیں۔ وہ اس کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ یہی تپش اُس کو کائنات میں مقامِ بلند تک پہنچاتی ہے۔ اِسی تپش کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچتا ہے۔ مسجد قرطبہ سے مردِ مومن کی فکری بالیدگی، اللہ و رسولؐ سے اُس کے عشق کے سُرور، اُس سے اُس کے نیاز و ناز، کرشمے انجام دینے کی قدرت، ہر میدان میں کامیابی سے ہم کنار ہونے اور مشکلوں کو آسان کرنے کی ہنرمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاکی و نوری ہونے کے باوجود عشقِ رسولؐ و خدا کی بدولت اُس میں اللہ کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو اُسے تمام دنیاوی ضرورتوں، آلائشوں سے آزاد کر دیتی ہیں اور وہ خود کو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ وہ سوائے اللہ کے اب کسی سے کوئی امید وابستہ نہیں کرتا لیکن اُس کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ وہ مہذب ہوتا ہے۔ اُس کی گفتگو سے دوسرے اُس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اُس کی نرم گفتگو دلفریب اور نگاہ دلنواز ہوتی ہے۔ وہ محفل میں ہو یا میدانِ جنگ میں، پاک دل و پاکباز رہتا ہے۔ وہ دنیا میں حق کی علامت بن کر اُس کے پیغام کو عام کرتا ہے تاکہ انسان اُس حیات دوام کو حاصل کر سکیں جو آخرت میں ہی میسر آسکتی ہے۔ یہ دنیا اُس کے لیے محض وہم و طلسم و مجاز ہوتی ہے۔ مومن کی شخصیت عقل و عشق کا ایک ایسا حسین امتزاج ہوتی ہے جو زندگی و آخرت دونوں میں کامرانی سے اُسے ہم کنار کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ذہن میں رسول اکرم کی شخصیت ہے جس تک رسائی حاصل کرنے کی وہ یہاں ہر مردِ مسلمان کو تحریک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لسانی و ہیئتی اعتبار سے اِس بند میں بھی اقبال اُس

معیار کو برقرار رکھتے ہیں جو اُنھوں نے اِس سے پہلے متعین کر رکھا ہے۔ اسی لیے ہر لفظ، ہر استعارہ، تشبیہہ یا پیکر انتخاب نظر آتا ہے۔ دنوں کی تپش، شبوں کا گداز، مقام بُلند، خیالِ عظیم، سرور، شوق، نیاز، ناز، بندۂ مومن کا ہاتھ، کار آفریں کار کشا، کارساز، خاکی، نوری، مولا صفات، غنی، بے نیاز، امیدیں قلیل، مقاصد جلیل، دلفریب، دلنواز، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، رزم، بزم، حلقہء آفاق، گرمیٔ محفل یہ محض استعارے نہیں ایسے پیکر بھی ہیں جو موضوعی حقائق کو معروضی پیکر عطا کرتے ہیں۔ یہ استعارے یا پیکر خالی نہیں بلکہ بھرے ہوئے برتن ہیں۔ یہاں قاری کے لیے اقبالؔ بہت کم گنجائش رکھتے ہیں کہ وہ اپنی قرأت کے دوران اُس میں کوئی اضافہ کر سکے۔ ایک طرح سے یہاں اقبالؔ قاری کے ایمان کا بھی امتحان لیتے ہیں۔ اگر وہ ایمان کی دولت سے سرشار نہیں تو وہ ان استعاروں یا پیکروں کے مفہوم کو پا ہی نہیں سکتا نہ اُس جمالیاتی حدّت کو محسوس ہی کر سکتا ہے جو اُن کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔

اگلے دو حصوں میں اقبالؔ مسجد قرطبہ کے فنی و فکری پہلوؤں پر مزید گفتگو کرتے ہیں۔ فنی اعتبار سے وہ اُنھیں اس قدر مکمل نظر آتی ہے کہ وہ اُسے کعبۂ اربابِ فن قرار دیتے ہیں اور فکری اعتبار سے وہ اُنھیں اسلام کی عظمت کا اشاریہ نظر آتی ہے۔ زمین پر اُس جیسی حسین و پر شکوہ اور کوئی مثال نہیں ملتی اگر کہیں ملتی ہے تو وہ مسلمان کا دل ہے جس نے اُسے جنم دیا ہے۔ وہ عشق الٰہی کا جذبہ جس نے اُس کی تعمیر کو ممکن بنایا وہ مسلمان کے دل میں ہے۔ اب اقبال اُن عربی شہسواروں کی عظمت کو بیان کرتے ہیں یعنی مجموعی اعتبار سے عربوں کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہسپانیہ کی تاریخ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اقبال کو اس بات کا شدید صدمہ ہے کہ اس قدر حسین کارنامے انجام دینے والوں کا اب وہاں کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہاں اپنے قدم جمائے وہ رسول اکرمؐ کے اخلاقِ عظیم کے پیرو تھے۔ اِسی لیے وہ ایسے نشانات قائم کر گئے جنھیں وقت بھی مٹا نہیں سکا۔ وہ شاہی میں فقیری کرتے تھے۔ اُنھوں نے ایسی اخلاقی بُلندی کی وجہ سے مغرب کی ظلمت میں نئے چراغ روشن کیے اور دنیا کی ایسی تربیت کی کہ اُنھیں ترقی کی منزلیں طے کرنے کا راستہ مل گیا۔ یہ اُنہیں سچے مسلمانوں کی دین ہے کہ آج بھی ہسپانیہ کی زمین اور عوام خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں ہیں۔ بوئے یمن اور رنگِ حجاز آج بھی اُس کی ہواؤں اور نواؤں میں ہے۔ مسجد قرطبہ کی وجہ سے آج بھی وہ زمین دیدۂ انجم میں آسمان کا درجہ رکھتی

ہے۔ اگر چہ صدیوں سے اُسکی فضا اذانوں سے عاری ہے۔ وہاں نہ نماز ہوتی ہے نہ وہاں کوئی اذان دیتا ہے۔ اور پھر اقبالؔ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ نہ جانے آج وہ قافلے والے کہاں ہیں جنھوں نے اِس سرزمین کو آسمان کے لیے باعث رشک بنا دیا تھا۔ یعنی ایک طرح سے وہ اہل اسلام کو تحریک دے رہے ہیں کہ وہ ایک بار پھر اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ اگلے کچھ شعروں میں اقبالؔ یورپ میں آئے بہت سے فکری انقلابات کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مسیحی دنیا کو پاپائے روم کے جبر سے آزاد کر کے نئی زندگی کا راستہ دکھایا۔ لوتھر کنگ نے پاپائے روم کی معصومیت پر سوالیہ نشان لگا کر بائبل پر از سر نو غور و خوض کرنے کی تحریک دی۔ انقلاب فرانس نے یورپ کو جمہوریت کا راستہ دکھایا۔ مسلمانوں میں بھی ایک اضطراب جاری و ساری ہے۔ جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اُن میں بھی جلد ہی کوئی انقلاب رونما ہونے والا ہے لیکن وہ انقلاب کیسا ہوگا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ آج وسط ایشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اقبال کی نظر شاید پہلے سے اُسے دیکھ چکی تھی۔ اِسی لیے اِس حصے کے اِن اشعار میں وہ الہامی کیفیت صاف ظاہر ہو رہی ہے جس کی پیش بینی وہ کر رہے تھے۔ روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب۔ رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں/ دیکھیے اِس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔ گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

آخری بند کا آغاز ایک بہت ہی خوبصورت منظر سے ہوتا ہے۔ وادیِ کہسار میں شفق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل چھائے ہوئے ہیں جس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتاب لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا ہو۔ ابتدائی دونوں مصرعوں میں بہت ہی خوبصورت پیکر برتے گئے ہیں جیسے وادیٔ کہسار، غرقِ شفق، سحاب، لعلِ بدخشاں کے ڈھیر، اِس پر طرہ یہ کہ اِسی حسین پس منظر میں کسان کی بیٹی کے سادہ اور پر سوز گیت کی مدھر تان سنائی دیتی ہے جو دل کی کشتی کو بہا لے جاتی ہے۔ نوجوان دوشیزہ کا لطیف گیت، سننے والے کے دل کے لیے سیل کا کام کرتا ہے۔ اِس حسین پس منظر میں شاعر بھی مسجد قرطبہ کے قریب بہتے دریا جس کا نام داء الکبیر ہے، سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے دریا تیرے کنارے کوئی شخص کھڑا کسی اور زمانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ نیا زمانہ اگر چہ ابھی پردۂ تقدیر میں ہے لیکن شاعر کی نگاہ اُس کی صبح کو صاف دیکھ رہی ہے۔ پھر شاعر اپنی بات پر مزید زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میں آنے والے زمانے کے چہرے سے

پردہ اٹھادوں تو انگریز قوم میری نواؤں کی تاب نہیں لا سکے گی۔ وہ زندگی موت سے بدتر ہے جس میں انقلاب لانے کی قدرت نہ ہو کیوں کہ کشمکش انقلاب ہی امتوں کو نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ موت کے ہاتھوں میں وہ قوم شمشیر کی مانند ہوتی ہے جو ہر زمانے میں اپنے عمل کا حساب کرتی ہے۔ اس بند کا آخری شعر فنونِ لطیفہ اور ادب کی تخلیق سے متعلق اقبال کے نظریے کو پیش کرتا ہے: سخت محنت کے بغیر سارے نقش نامکمل رہتے ہیں اس طرح نغمہ خون جگر یعنی شدید ریاضت کے بغیر پاگل کی بڑ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور وہ امت مسلمہ کو اسی جدوجہد کی طرف لوٹنے اور اُسے اپنا شعار بنانے کی تحریک دیتے ہیں جس نے اُنھیں حیات دوام عطا کی ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی یہ بند دوسرے بندوں کی طرح بہت خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت استعارے اور پیکر برتے گئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ نظم اردو کی نظمیہ شاعری میں اپنی تاریخی، فکری اور فنی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ بار بار پڑھنے اور نئے پیمانوں سے ماپنے کا تقاضا کرتی ہے۔

اقبالِ کشمیر

غلام نبی خیالؔ

اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو کشمیری نژاد شخصیات اپنے مادرِ وطن سے دُور ہندوستان کے مختلف خطّوں میں زندگی کے شعبہ ہائے عمل میں اپنے فہم و دانش اور تخلیقی صلاحیتوں کی جلوہ باریوں سے دوسروں کو متاثر کرنے لگیں اُن میں سے بدقسمتی سے صرف معدودے چند ایسے شاعر ادیب اور صحافی نظروں کے سامنے ہیں جنہوں نے کشمیر کی اُس تحریک آزادی کو اپنے فن اور قلم کی حِدّت و حرارت سے شعلوں کی شکل عطا کی جو تحریک کشمیر میں ایک پُوری صدی پر پھیلے ہوئے شخصی راج کی انسان کش اور عوامی استحصال کے پنجے تلے بہت حد تک پسپا ہو چکی تھی۔

اِدھر تیرہ جولائی ۱۹۳۱ء سے پہلے ہی ۱۹۲۴ء میں ریشم خانے کے احتجاجی اہل کاروں کو لوہے کے بھاری گولوں سے باندھ کر ایک مقامی نالے میں دریا برد کیا گیا تھا اور اُدھر اس قربانی کی چنگاری رفتہ رفتہ آتش کدۂ حُریت کی شکل اختیار کر رہی تھی جو بعد میں ایک انسانی طوفان بن کر ۱۳ جولائی کے دن کشمیر کی ساری تاریخ کو بدلنے کا موجب بن گئی۔

اُن واقعات کشمیر کی عکاسی کرنے والوں میں علامہ اقبال کے سوا ہمیں شاذ ہی ایسا کوئی فرزندِ کشمیر نظر آتا ہے جس نے درد کشمیر کو محسوس کیا ہو اور اس کے نالہ و فغان کو اپنے صریر خامہ کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہو۔ ان کشمیری نژاد گراں قدر ہستیوں میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، برج نراین چکبست، رتن ناتھ سرشار، دَیا شنکر نسیمؔ، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، آغا حشر کاشمیری، چراغ حسن حسرت، شورش کاشمیری اور کئی اور اکابرین اور اصحاب فکر و نظر شامل ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان سے قطع نظر چند غیر کشمیری ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے حریت کشمیر کی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کی حمایت میں اپنے قلم کا بے باکانہ استعمال کیا۔ ان میں مولانا ظفر علی خان اور حفیظ جالندھری کے اسماء سرفہرست ہیں۔ حفیظؔ نے تیرہ جولائی کے خون آشام واقعہ پر جو نظم ''خون کے چراغ'' لکھی اور اس سے قبل ''تصویر کشمیر'' کے عنوان سے ایک

طویل نظم میں کشمیر کے دل آزار اور دل شکن واقعات کو بیان کیا اس کے مدنظر یہ دونوں منظومات ابدی فن پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سارے تناظر میں علامہ اقبال کی ذات باصفات کشمیر کے حوالے سے مٹیالے اور دُھندلے مطلع پر ایک ماہِ تاباں کی طرح نُور افشاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے کشمیر میں عوامی تحریک کو بڑھاوا دینے کی غرض سے جو بیش بہا رول ادا کیا اُس کی افادیت اِس حقیقت کے پیشِ نظر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اقبال زندگی میں صرف ایک ہی بار کشمیر آئے لیکن یہاں آکر اُنہوں نے جس طرح شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں کشمیر کے محکوم و مجبور عوام کو ایک عالمِ بے بسی میں شب و روز گذارتے دیکھا اُس سے اقبال کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا اور اُس نے عام کشمیری کے اس درد اور تڑپ کو بُری طرح محسوس کیا۔

اپنی ۶۱ سالہ زندگی کے دوران اقبال فکری اور ذہنی طور پر کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کے ساتھ برابر وابستہ رہے اور انہوں نے ایسے کسی موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جب انہیں اپنے جُدا ہو چکے بھائیوں کے حالِ زار کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرنا تھا۔

علامہ اقبال جب جُون ۱۹۲۱ میں کشمیر تشریف لائے تو انہوں نے یہاں سرسبز اور شاداب وادیوں کو سلگتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چناروں کی چھاؤں میں انسانی غُلامی کی آگ ہر گرد و پیش کو خاکستر میں تبدیل کر رہی ہے۔ انہوں نے یہاں نشاط باغ میں ایک فارسی نظم تحریر کی۔ اس میں انہوں نے اہلِ کشمیر کی غفلت اور اُن کے عالمِ مجبوری میں زندگی گذارنے کے طرزِ عمل کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

کشیری کہ بابندگی خُو گرفتہ بُتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بُلندے خودی نا شناسے ز خود شرمسارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے نہ در سینۂ او دِلِ بے قرارے

ان اشعار پر کشمیر میں اور خاص کر لاہور میں چند کشمیر نواز دانشوروں نے یہ اعتراض کیا کہ اس سے اہلِ کشمیر کی تضحیک ہوتی ہے لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبالؔ اپنی اس شاعرانہ سرزنش سے کشمیری عوام کو خوابِ غلامی سے بیدار کر کے حصول آزادی کی خاطر سر بکف ہو کر میدانِ کارزار میں اُترنے

کی ترغیب دے رہے تھے لہذا یہ اعتراضات محض ذاتی نکتہ چینی پر مبنی تھے جس طرح مولانا ظفر علی خان نے اس وقت بھی اقبال پر طنز کیا جب اقبال کا Knighthood یعنی سر کا خطاب دیا گیا اور مولانا نے کہا:

سرکار کی دہلیز پر سَر ہو گئے اقبال

اقبال اگر کشمیری قوم سے مایوس ہو چکے ہوتے تو وہ ایک عالمِ بے چارگی میں بھی، جس میں کشمیریوں کے لئے محبت اور شفقت کی شدت اور حرارت شامل تھی، اس نوع کے اشعار نہیں کہتے کہ:

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

یا وہ ایک فکری اضطراب میں کشمریوں کے تئیں یہ صدائے حق اور دُعائے فردا بلند نہیں کرتے:

ازاں مَے فشاں قطرۂ بر کشیری کہ خاکستر ش آفریند شرارے

''ساقی نامہ'' میں کشیری کہ بابندگی خوگرفتہ بُتے می تراشد زِ سنگِ مزارے'' کی تخلیق واشاعت کے بعد مُخالفت کا جو طوفانِ بے ہنگم کھڑا ہوا اُسے دبانے کے لئے اقبال نے خود ۲۶ مئی ۱۹۲۳ء کو اُس وقت کے محکمہ خارجہ کے ایک افسر میر خورشید احمد کو اس مُراسلے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔ ''ساقی نامہ ''کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گِلہ سُن کر مجھے تعجب ہوا۔ افسوس ہے کہ ہندوستان سے فارسی رخصت ہو گئی۔ سعدیؔ نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہم سفر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دُکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہے نہ کہ کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اُن کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آباواجداد اہلِ خِطّہ میں سے ہیں۔''

یہ تو مصلحت پسندی کی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہی معلوم ہوتی ہے کہ کشمیر اور اہل کشمیر کے بارے میں اقبالؔ کے ہمدردانہ اور مشفقانہ خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔ ایک طرف وہ کشمیریوں کی آزادی کے علمبردار تھے لیکن دُوسری جانب کشمیریوں کی غفلت شعاری، توہم پرستی اور تقدیر نوازی کے جذبات سے ہم آہنگ نہیں تھے کیونکہ وہ عمل اور جہد مسلسل کے پیامبر تھے۔ اسی لئے محمد دین فوقؔ کے نام ۸ جون ۱۹۱۷ء

کے خط میں اہل کشمیر کی قبر پرستی پر ہر قلم کو حرکت دینے کی ترغیب دے رہے تھے ''کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور اُن کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے'' اور ۱۹۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کو فوق ہی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ ''اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی رُوح پیدا کی جائے''۔

اقبال اور کشمیر کے حوالے سے اب میں ایک ایسے سوال کو بار دِگر اس محفلِ باوقار میں اٹھانا چاہتا ہوں جس کی رُو سے محترم جگن ناتھ آزاد نے ''اقبال اور کشمیر'' نام کی اپنی تصنیف میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے جاوید نامہ میں شیخ محمد عبداللہ اور مولانا احمد اللہ ہمدانی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اس مُتنازعہ فیہ نکتے کی گرہ کشائی سے مراد صرف یہی ہے کہ تاریخی واقعات کو اور بالخصوص جب اُن کا تعلق شاعرِ مشرق کے نظریات کے ساتھ ہو، صحیح اور مُستند تناظر میں پیش کر کے آزاد صاحب جیسے اقبال شناس کے مُفروضے کو معتبر ثبوت کے ساتھ رد کیا جائے ورنہ اس کی بنا پر کشمیر کی اقبال نوازی سے وابستہ خاص طور پر نوجوان نسل کے گمراہ ہونے کا اندیشہ قائم رہے گا۔ اقبال اور کشمیر کے موضوع پر آج تک تقریباً نصف درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں تین کتابیں جو سب سے پہلے شائع ہوئیں ایک ہی عنوان یعنی ''اقبال اور کشمیر'' سے بالترتیب جگن ناتھ آزاد، صابر آفاقی اور سلیم خان گمی نے تصنیف کی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ تینوں تصانیف ایک ہی سال یعنی ۱۹۷۷ء میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ غالباً ان کتابوں کا سال اشاعت اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۷ء اُن کے سوویں (۱۰۰) یوم پیدائش کے طور پر منایا گیا۔ اس عظیم شاعر اور فلسفی کو خراج تحسین ادا کئے جانے کی غرض سے یہی سال ان کُتب کو منظر عام پر لانے کے لئے منتخب کیا گیا۔

اس کے بعد میں نے ''اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' کے نام سے اردو میں اپنی کتاب سب سے پہلے ۱۹۹۷ء میں از خود شائع کی اور اس میں پہلی بار اُس مُتنازعہ فیہ سوال کو وضاحت سے پیش کر کے صحیح واقعات سے قاری کو آگاہ کیا گیا۔ میری تصنیف کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکادمی لاہور پاکستان نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا جس کا پیش لفظ احمد ندیم قاسمی نے لکھا اور اب اس کا تیسرا ایڈیشن گذشتہ دنوں دہلی سے طبع ہو کر آ چکا ہے۔

ڈاکٹر فریدہ مجید حکاک صاحبہ نے بھی اسی موضوع پر اپنی تصنیف شائع کی ہے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اس نہایت اہم اور حل طلب سوال کو زیر بحث لانے کی میرے سوا کسی اور نے نہ تو کوشش ہی کی اور نہ ہی اُن کی کتابوں میں یہ مسلہ توضیحی طور پر زیرِ تجزیہ لایا گیا۔ میری یہ دِلی خواہش ہے کہ اقبال شناس اور کشمیر کے مُحب الوطن اہلِ قلم اور محقق اس موضوع پر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر قلم اٹھائیں اور اس کی اصل حقیقت کو معتبر تحقیق کے بعد سامنے لائیں۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ علامہ نے ''جاوید نامہ'' میں ایک جگہ کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ اور ایک کشمیری دینی مُبلّغ مولانا احمد اللہ ہمدانی کو کشمیر کے ممتاز ترین قائد قرار دے کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس مفروضہ کی اُسی وقت سردار جعفری نے بھی پُر زور الفاظ میں تردید کی تھی۔ جاوید نامہ کی اشاعت فروری ۱۹۳۲ء میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ زیر بحث نظم اقبالؔ نے اُس سے قبل ہی تخلیق کی ہوگی جس میں بقولِ آزاد شیخ صاحب کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ اُس وقت شیخ صاحب میدانِ سیاست میں محض ایک طفلِ مکتب تھے اور کسی بلند مرتبے پر نہیں پہنچے تھے۔

آزاد کے مفروضے کی تردید میں اقبالؔ کی نظروں میں شیخ محمد عبداللہ کے مقام کا تعین اس خط سے بھی کیا جاسکتا ہے جو علامہ نے شیخ صاحب کو ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو یعنی جاوید نامہ کی اشاعت کے کم از کم بیس ماہ بعد لکھا اور جس میں انہوں نے اس کشمیری سیاست دان کو مکرمی یا محترمی یا شیخ محمد عبداللہ صاحب کے الفاظ سے مخاطب ہونے کے برعکس صرف ڈیر شیخ عبداللہ صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ کیا یہ بات ایک حقیقی واقعہ کے طور پر قبول کی جاسکتی ہے کہ اس پس منظر میں علامہ شیخ صاحب کو اپنی ایک شعری تخلیق میں خراج عقیدت پیش کرتے؟ ۲۲ جنوری ۱۹۳۴ء کے ایک اور مُراسلے میں سیّد نعیم الحق وکیل کے نام شیخ صاحب کا ذکر اقبال نے اس عام انداز میں کیا ہے۔ ''میں نے شیخ عبداللہ صدر کانفرنس سے بھی تذکرہ کیا ہے''۔

شیخ عبداللہ کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۳۱ء میں ہوا جب وہ علی گڈھ مُسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے آئے تھے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی سرکار میں ایک سکول میں مُدرّس ہو گئے تھے۔ اسی طرح میر واعظ احمد اللہ ہمدانی سے زیادہ کشمیر کی سیاسی زندگی کے قافلہ سالاروں میں میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ، خواجہ سعد الدین شال، غلام احمد عشائی اور غلام نبی گلکار پیش پیش تھے۔ میر واعظ ہمدانی کے بارے میں خود

شیخ صاحب نے یہ واقعہ سُنایا ہے کہ جب وہ کشمیر چھوڑ کر لاہور گئے تو علامہ اقبال نے اُنہیں وہاں پناہ لینے پر زبردست جھاڑ پلائی اور یہاں تک کہا کہ اگر تم وہاں گولی کھا کر شہید ہو جاتے تو بہتر تھا۔ اس پر ہمدانی نے اقبال کے بارے میں شیخ صاحب ہی کی موجودگی میں یہ کہا تھا کہ ''وہ چرسی قسم کا ایک آدمی ہے جو خود روزے بھی نہیں رکھتا اور ہمیں گولی کھانے کی ہدایت کرتا ہے''۔ کیا عقل اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے کہ اقبالؔ مولانا ہمدانی کو انہی دنوں اپنے ایک شعری فن پارے میں خراج تحسین پیش کریں؟۔

اسی تناظر میں کلیم اختر کی تصنیف ''اقبال اور مشاہیر کشمیر'' میں مذکور مولانا محمد علم الدینؔ سالک کے حوالے سے اس واقعہ کی روایت موجود ہے۔ جس کے مطابق سالک کہتے ہیں کہ ''مجھے یاد ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی کے صدر تھے۔ انہیں شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کے خطوط موصول ہوئے۔ آپ انہیں پڑھتے اور آتش دان میں پھینک دیتے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب تشریف لائے اور گلہ کیا کہ آپ جواب نہیں دیتے۔ علامہ فرمانے لگے ''میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لئے ٹکے ٹکے کیلئے لوگوں کے پاس جاؤں''۔

اقبال کے اس بیان سے بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُن کی نظروں میں شیخ صاحب کی شبیہہ کس حد تک مکدر ہو چکی تھی کہ وہ ان کے خطوط پڑھے بغیر یا پڑھنے کے بعد نذرِ آتش کرتے کیونکہ اُن کے بقول ان مُراسلوں میں صرف مالی امداد کی التجائیں کی جاتی تھیں۔

میں اس موضوع سے یہیں پر دست کش ہو کر اس نکتے کو جدید اور سائینسی بنیادوں پر تحقیق کے ذریعہ گرہ کشائی کیلئے چھوڑ دیتا ہوں اور یہ کرنا ہم عصر تاریخ کشمیر کے صفحات کی مسخ شدہ صُورت کو اصلی زیب و زیبائش سے آراستہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نوازوں، تحقیق کاروں اور اقبالیات کے طلبہء پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ علامہ اقبال شیخ محمد عبداللہ اور جگن ناتھ آزاد کی شخصیات کے محور کے ارد گرد طواف کرنے والے اس بیانیہ کو طاقِ نسیاں سے نکال کر اور اُس پر سے وقت کی گرد جھاڑ کر حقائق کو سامنے لا کر اقبالؔ کے ساتھ بھی انصاف کریں اور ہماری مسخ شدہ تاریخ کے اس اضافی صفحہ کو بھی صداقت کی روشنائی سے ازسرِ نو قلم بند کریں۔

علامہ اقبالؔ کشمیر کے لئے ایک پُرعزم سپاہی، کشمیریوں کے لئے با اعتقاد ہمدرد اور کشمیر کی آزادی کی خاطر

ایک ایسے مجاہد کی صورت میں اُبھر کر برّصغیر کی ادبی دُنیا میں سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے کشمیر کی تہذیب و ثقافت، وراثت اور کشمیریت کے لئے اپنے قلم کو تلوار بنا کر اہلِ کشمیر کی سب سے زیادہ اور سب سے پُر اثر ترجمانی کی ہے۔

میں اس مقالے کو اقبالؔ پر لکھی گئی فیض احمد فیض کی نظم کا پہلا بند سنا کر اختتام پر لاتا ہوں۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گذر گیا

سُنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا

تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دِلوں میں اُتر گیا

کشمیر میں اقبال شناسی کی ایک زریں لہر..... غنیؔ کی بصیرت

پروفیسر مرغوبؔ بانہالی

کئی دہائیوں پر محیط اپنے تجربے کی بُنیاد پر مُجھے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی مسرت حاصل ہورہی ہے کہ دانشگاہِ کشمیر کا اقبال انسٹی ٹیوٹ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اقبال شناسی کی اُس منزل کی جانب رواں دواں ہے جو ''مرا نورِ بصیرت عام کردے'' جیسی دُعا کے تناظر میں کلامِ اقبال کے فلسفۂ خُودی اور مقصدیت کے حوالے سے اقبال کے مُنتخبہ اشخاص خصوصاً منتخبہ شعرا اور اُنکے مُنتخبہ اشعار کو پہچاننے کا خاص تقاضا کرتی ہے۔ چونکہ فارسی ادب سے کشمیر کے جدید ڈگری یافتہ گان کی روز افزوں دوری دراصل اُن کی کلام اقبال کے دو تہائی حصے سے روز افزوں دوری بن رہی ہے۔ اِس لحاظ سے میں آج اقبال کے روشن کئے ہوئے غنی کی بصیرت کے چند ایسے پہلو نشاندہی میں لانے کی کوشش کروں گا جن کی طرف خود اقبال نے حساس کشمیریوں کی توجہ مبذول کرانی چاہی ہے۔ پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پیشرو شعراء میں سے چند سرکردہ فارسی شاعروں کے تئیں اپنی خاص عقیدت دو طرح سے پیش کی ہے۔ پہلی صورت میں اُن کے ایسے اشعار پر تضمین لِکھ کر جن میں اقبال اپنے فلسفۂ خودی، اور اپنی مقصدیت سے متعلق کسی طرح کی مناسبت اور مطابقت محسوس کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں از روئے عقیدت ان کی شخصیات اور فکر و فن کی خصوصیات کو نشاندہی میں لانے کیلئے انہیں باضابطہ موضوعِ سخن بنا کر۔ البتہ اس قبیل کے شعرا میں بھی جن کے ساتھ اقبال کی خاص دلبستگی رہی ہے انہیں دونوں طرح کی عقیدت پیش کرنے میں شاعر مشرق محض مرید ہندی بنتے ہیں۔ جبھی تو کہا ہے ؎

برویم بستہ در ہا را کشاید
دوہیت از پیر رومی یا ز جامی

علامہ اقبال اپنے مرغوب ترین شعراء یعنی مولانا رومی اور مولانا جامی جیسے روشن ضمیر قبیل کے ایرانی شعرا کے علاوہ خاص طور پر برصغیر کے غنی کشمیری اور مرزا غالب جیسے پیشروؤں کی نرگسیت کے تئیں بھی دونوں طرح کا

اظہارِ عقیدت کرتے ہیں بلکہ ان کے اشعار پر تضمینیں لکھنے کے علاوہ اُن کو کئی کئی بار موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ بہر حال اعلیٰ مقصدیت والے تخلیقی سفر کے آغاز میں فارسی شاعروں سے زیادہ مُناسبتِ ذہنی دکھاتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی پہلی اُردو تصنیف بانگ درا میں جن درجن بھر شعراء کے شعروں پر تضمینیں لکھی ہیں۔ ان میں غنی کشمیری کے علاوہ شیخ سعدی، مرزا صائب، عرفی شیرازی، ابو طالب کلیم، فیضی، قاآنی، ملا عرشی، انیسی شاملو، میر رضی دانش اور ملا قمی شامل ہیں۔ پھر ضرب کلیم میں جن شعراء کو باضابطہ موضوعِ سخن بنایا گیا ہے اور ایک ایک تخلیق ان کے حوالے سے معرضِ وجود میں لائی گئی ہے اُن میں حکیم سنائی، منصور حلاج، خاقانی اور بیدل شامل ہیں۔ اسی طرح جن شاعروں کے کسی شعر کو اقبال نے اپنی کسی تصنیف کے ماتھے کا یا کسی خاص حصے کے ماتھے کا جھومر بنایا ہے ان میں مولانا رومی، مولانا جامی کے علاوہ نظیری نیشا پوری اور عزت بخاری جیسے شاعر بھی شامل ہیں۔ لیکن اپنی شاہکار تصنیف جاوید نامہ میں اقبال کا غنی کشمیری کو حضرت شاہ ھمدانؒ کی خاص مصاحبت میں دکھانا وہ بھی آنسوئے افلاک جیسے خاص مقامِ اعلیٰ پر فائز دِکھانا۔ کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ اسی مقام پر اقبال اپنے مُرشد رومی کی روح کو ملا محمد طاہر المتخلص غنی کشمیری کی توصیف و تکریم میں یوں رطب اللسان دکھاتے ہیں ؎

''شاعرِ رنگین نوا طاہر غنی فقر اُو باطن غنی ظاہر غنی''

گویا وہ فقر جس کو فخرِ کونین رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے فخر کی چیز قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِی اُسی الفقر کا رنگ غنی کے باطن و ظاہر پر چڑھا ہوا ہے اور اسی فضیلت کے باعث اقبال غنی کی زبان سے وہ اسرار کہلواتے ہیں جو اُس وقت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے برصغیر کو آزادی اور ترقی سے ہمکنار کرا سکتے تھے خصوصاً اس وقت کے آزادی پسند کاروان میں خود اقبال جیسے چند کشمیری الاصل برہمن زادگانِ زندہ دل کا پیش پیش ہونا بڑے فخریہ انداز سے موضوعِ شعر بنایا گیا ہے۔ بلکہ اُن سے شاطر افرنگیوں اور مغربی حکمرانوں کے خائف ہونے کا راز بھی بتایا گیا ہے کیونکہ وہ عام کشمیریوں کی بہ نسبت کافی تیز بین ہیں۔ پُختہ کار ہیں اور سخت کوش ہیں اقبال نے کشمیریوں کی انہی صفات کے ناطے اپنے آبائی وطن کو یہ کہہ کر لائق تعریف گردانا ہے ؎

اصلِ شان از خاکِ دامنگیر ماست مطلعِ ایں اختران کشمیرِ ماست

اس فخریہ اظہار کو غنی کی زبانی یہ بات کہلوا کر مکمل کیا گیا ہے کہ خطۂ کشمیر کی خاص آب و ہوا سے آس پاس کے پہاڑوں کو بھی خاص رنگ و بو نصیب ہو جاتی ہے اور تخلیقی ذہن بھی خاص اونچائیوں کو چھو لیتے ہیں۔

جاوید نامہ میں دکھائے گئے اپنے خاص تخیلی سفر کے اسی اعلیٰ ترین پڑاؤ پر اقبال غنی کو حضرتِ شاہِ ہمدان علیہ رحمہ کا تعارف خاص مُحسنِ کشمیر اور معمار ثقافت کشمیر کی حیثیت سے یوں کراتے ہیں ؎

سیّد السادات سالار عجم دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم

یہاں پر منجملہ اور فضیلتوں کے اقبال بزبانِ غنی حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کو ہی کشمیر کے سب سے بڑے روحانی اور سماجی انقلاب کا اصل بانی قرار دیتے ہیں۔ وہ کشمیر کے ہر چھوٹے بڑے فرد پر اُنکے احسانات کا گہرا اثر ہونے کی بات یوں کرتے ہیں ؎

سیّدِ آن کشورِ مینو نظیر میر و درویش و سلاطین رامشیر
خطہ را آن شاہِ دریا آستین داد علم و صنعت و تہذیب و دین

اقبال بزبانِ غنی یہ اسی مردِ مومن کی روحانی تربیت کا ثمرہ قرار دیتے ہیں کہ اُس دور میں کشمیر کو گوناگوں صنعتی و علمی ترقی کے باعث ایرانِ صغیر کہا گیا تھا۔ اسی مقام پر غنی کی روح اقبال کو مخاطب کر کے شاہِ ہمدان کی تعلیمات کا فیض عام کرنے کا مشورہ ان الفاظ میں دیتی ہے ؎

آفرید آن مرد ایرانِ صغیر باہنر ہایِ غریب و دلپذیر
یک نگاہِ او کشاید صد گرہ خیز و تیرش را بدلِ را ہے بدہ

یہ باتیں کہنے والے غنی کی معنویت اقبال پر تین حیثیتوں سے روشن ہوگئی ہے۔ اول اس لحاظ سے کہ غنی اپنے اہلِ وطن کی حالت زار دیکھ کر سب سے زیادہ آتش بجان شاعر ہے جو کشمیر کے دوسرے تمام شاعروں میں ممتاز ہے۔ دوئم یہ کہ غنی کا فخر غیور اور جوہر خودی اقبال کے بنیادی فلسفہ سے قریب ترین مُناسبت رکھتا ہے۔ سوئم یہ کہ اقبال کی طرح غنی نے بھی مادری زبان کو نہیں بلکہ عربی کے بعد سب سے اہم ثقافتی زبان فارسی کو اسلئے اپنا ذریعۂ اظہار چُن لیا ہے کہ اُسی میں اسکی آفاقی اپیل والی شاعری بڑے پیمانے پر اپنی دردمندی بانٹ سکتی تھی کیونکہ فارسی زبان ہی مُسلم اکثریت والے کئی پُر آشوب علاقوں میں مُوثر ترین ذریعۂ اظہار کا درجہ رکھتی تھی اِسی پس منظر میں اقبال..... پنجاب کی ابتری پر افسوس کرنے کے بعد حوضِ کوثر کے کنارے

سے غنی کی درد و سوز میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنتے ہیں کہ ؎

جمع کردم مُشتِ خاشا کی کہ سوزم خویش را گُل گُمان دارد کہ بندم آشیان در گُلستان

یعنی روز افزوں مظالم دیکھ کر مجھے اپنے آپ کو جلانے کی نوبت آگئی ہے چنانچہ میں خُود سوزی کیلئے تنکے جمع کرنے لگ گیا ہوں لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اہلِ گلشن اِس خود سوزی کے عمل کو بھی میری آشیان بندی قرار دے رہے ہیں۔

اقبال تضمین کیلئے غنی کا ایسا شعر چُنتے ہیں جس میں کشمیر کے قُدرتی وسائل دوسروں کے ہاتھ لگ جانے کا رونا رویا گیا ہے بلکہ جس میں مفلُوک الحال اور جفاکش کشمیریوں کے استحصال کا وہ منظر بھی موجود ہے جو اقبال نے یوں ابھارا ہے۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

یعنی دوسروں کے لئے شال دوشالے اور قیمتی ملبوسات تیار کرنے والا خود چیتھڑے پہننے پر مجبور ہو رہا ہے۔

اس مضمون کا حامل غنی کا عالمگیر شہرت والا شعر اقبال کی تضمین میں ان الفاظ پر مشتمل ہے ؎

غنی روزِ سیا ہے پیرِ کنعان را تماشا کن کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشمِ زلیخا را

یعنی بدنصیبی کی یہ انتہا دیکھیے کہ نیک باپ یوسف جیسے فرزندِ ارجمند سے ہاتھ دھو چُکا ہے اور وہ زلیخا کی آنکھیں روشن کر کے باپ کو اندھا کرنے کا باعث بن گیا ہے۔

غنی اقبال کی نظر میں ایسا بلبلِ کشمیر ہے جس کو اقلیم معنی کا امیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے کلام کی تشبیہہ و تمثیل سے معمور کرامت مُردوں کو زندہ کر سکتی ہے۔ ان مفاہیم کے حوالے سے اقبال کے ایسے فارسی اشعار پر تفصیلاً غور کرنا لازمی بن جاتا ہے جن میں روحانی ترقی پانے کے لئے مادی اشیاء کو کم سے کم کرنے اور حقیقتاً کچھ پانے کیلئے کچھ کھونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسی خصوصیت کے تحت غنی اقبال کا ایسا پسندیدہ شاعر ہے جس کی آواز بلبلوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہے۔ اور جو واقعاً جنت نظیر کشمیر کے دکھوں کا ترجمان ہے۔

غنی آن سخن گوئی بلبل صفیر نوائے کشمیرِ مینو نظیر

پھر غنی کی بے قرار روح کو گواہ بنا کر زندہ رود نام سے علامہ اقبال حضرتِ شاہِ ہمدان کے حضور کشمیریوں کے

استحصال اور پائمال ہونے کی داستانِ غم عرض کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ذہین قوم کی غریبی اور غلامی کا نقشہ وہ اس دردمندی سے کھینچتے ہیں:۔

جان زِ اہلِ خطہ سوزد چوں سپند خیزد از دِل نالہ ہائے دردمند
زیرک و دَرّاک و خوش گلِ ملتے است در جہان تردستی او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ او است درنَے من نالہ از مضمونِ اوست
اَز خودی تابے نصیب افتادہ است در دیارِ خود غریب افتادہ است
از غلامی جذبۂ ہای او بمرد آتشے اندر رگِ تاکش فُسرد
درزمانے صف شِکن ہم بُودہ است چیرہ و جانباز و پُر دم بُودہ است[1]

پھر خاص رجائیت سے یہ پیشگوئی بھی کی گئی ہے کہ ؎

باش تابینی کہ بے آواز صور ملتے بر خیزد اَز خاکِ قبور

یعنی بڑے مایوس کُن حالات میں بھی اُس دن کا انتظار کرتے رہو جب انہی قبروں کی خاک سے ایک زندہ قوم اُبھر کر دُنیا کو حیران کردے گی۔

---

[1] اقبالیات سے گہری دلچسپی رکھنے والے جو دوست ثقافتی اہمیت کی فارسی زبان سے واقف نہیں ہیں لیکن مجالسِ اقبال کی رونق برابر بڑھاتے رہتے ہیں اُن کے لئے میں اِن چھ فارسی شعروں کا اُردو ترجمہ بھی یہاں پر درج کرتا ہوں۔ پڑھ لیجئے گا۔

۱۔ خطۂ کشمیر کے باشندوں کی حالتِ زار دیکھکر میری جان اسپند کی طرح جل کر اُچھلتی ہے اور میرا دل دردمندی کے نالے بُلند کرتا رہتا ہے۔

۲۔ جتنی ذہین ہوشیار اور خوبصورت یہ کشمیری قوم لگتی ہے اُتنی ہی عبرتناک دُنیا میں اِس قوم کی استحصال زدگی ہے۔

۳۔ اِس قوم کا جام اپنے ہی خونِ جگر میں غلطاں ہے میری شاعری کی ایک دردناک ہوک اسی مضمون سے عبارت ہے۔

۴۔ جب سے اس قوم نے اپنی خودی کا سودا کر کے اپنا مستقبل کئی دلالوں کو سونپ رکھا ہے تب سے یہ قوم اپنے وطن میں پردیسی بنی ہوئی ہے۔

۵۔ دراصل غلامی نے اِس قوم کے مِلّی جذبوں کو ہلاکت میں ڈال رکھا ہے اور موجودہ سازشوں نے اِسکی اُمنگوں کی آگ کو بجھانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

۶۔ حالانکہ ایک زمانے میں یہ قوم دوسروں پر غلبہ پانے والی اور انہیں آداب زندگی سکھانے والی رہی اور اس باحوصلہ قوم کی تقدیر جلد پلٹا کھانے والی ہے۔

اردو نظم پر اقبالؔ کے اثرات

(بحوالہ راشدؔ اور فیضؔ)

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی کا بنیادی حوالہ اور پہچان اقبالؔ کی نظم ہے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اردو نظم کی بے نام و نسب، ناقص اور سپاٹ روایت اقبالؔ کی خلاّقانہ صلاحیتوں سے مس ہو کر جب منصۂ شہود پر آتی ہے تو وہ پہلی ہی نظر میں لوگوں کی توجہ کا محور بن جاتی ہے۔

ان کی پہلی نظم ''ہمالہ'' سے ان کی بے پناہ شہرت اور مقبولیت کا جو سلسلہ چل پڑا تھا اُس میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ان کے ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر ان کی ندرتِ اظہار اور انفرادیت کے اثرات ناگزیر تھے۔ اقبالؔ کی اس تخلیقی روش سے لوگوں میں سوچنے کا نیا انداز اور بات کو نئے ڈھنگ سے کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔ سچ یہ ہے کہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو اقبال نے سب سے زیادہ موثر طور پر اپنی فکری اور فنّی ضرورتوں کا حصہ بنایا۔ چنانچہ اقبال سے قبل اور بعد کی نظموں کو دیکھنے سے یہ حقیقت خود بخود عیاں ہو جاتی ہے کہ اُردو نظم پر بالواسطہ طور پر ان کا بہت بڑا فیضان رہا ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی درست ہے کہ اقبالؔ کا تتبع بہت آسان نہ تھا جس کا سبب شاید یہ نہ تھا کہ ان کا مبدۂ فکر اور شعری مواد مذہبی تھا، سچ یہ ہے کہ اس مواد کو فنّی ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے میں جس قدر اور جیسی دیدہ وری اور تخلیقی بصیرت درکار ہوتی ہے، وہ اکثر شعراء میں ناپید تھی۔ ان کی تخلیقی رفعت، بلندی، وسعت اور عمق تک پہنچنے کے لیے انہیں جیسی شخصیت کا ہونا لازمی تھا، جو ظاہر ہے کہاں سے لائی جا سکتی تھی۔ معاملہ اقبالؔ کا ہی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ میرؔ اور غالبؔ کا بھی تتبع باوجود تمام کوشش کے کس سے ہو سکا، تاہم ان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ جالندھری اور عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ کے ہاں اقبالؔ کے اثرات موجود ہیں لیکن فرق بھی نمایاں ہے۔

اقبالؔ نظم کے ان قادرالکلام جید شعراء میں سے ہیں جن کی برتری لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح طاری رہی کہ ان کے ساتھ نہ ترقی پسند تنقید نے انصاف کیا اور نہ ہی جدیدیت کے ہمنواؤں نے ہی انہیں درخورِ اعتنا سمجھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اپنی تمام تر عظمت و شوکت کے باوجود اقبالؔ مظلومیت

کے حصار سے باہر نہ نکل سکے۔ حد یہ ہے کہ جب کلاسیکی شعری اقدار اور خود اقبال کے سلسلہ میں ترقی پسند نقطۂ نظر میں کسی قدر تبدیلی بھی پیدا ہوئی تو سردار جعفری نے یہ کہا:

''پہلی بار اقبال کی شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے معنی میں آیا اور مزدور و سرمایہ دار کے تضاد کا احساس ہوا۔ اقبال نے ہی ان تصورات کو لے کر ان میں روحانیت شامل کر دی، یہی وجہ ہے کہ اقبال انقلاب کی دعوت بھی دیتے ہیں اور انقلاب سے گھبراتے بھی ہیں۔ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مارکس اور لینن کی تعلیمات میں سچائی ہے اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان میں روحانیت کی کمی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندو مسلم نفاق کی آگ کو انگریز سامراجی ہوا دے رہے ہیں اور اپنے مذہبی مطالبات سے اِس آگ پر تیل بھی چھڑکتے ہیں''۔

جدیدیت سے وابستہ حلقے میں اقبال کی انفرادیت اور تخلیقی صلاحیت کا اعتراف ضرور کیا گیا، تاہم ان کے تصورات کو یہ کہہ کر رد بھی کیا گیا کہ ہمعصر زندگی سے ان خیالات کی مطابقت اور مناسبت نہیں ہے۔ مزید برآں موجودہ عہد کے اینٹی ہیرو تصور سے اقبال کا تصورِ مردِ کامل اور مردِ مومن میل نہیں کھاتا۔ محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''علامہ اپنی عظمت کے تمام کھڑاگ کے ساتھ تاریخ کے arena میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ ان کا نام چلتا ہے تو لے دے کر امین حزیں سیالکوٹی اور اسی قبیل کے شعر طرازوں تک۔ علامہ کا اثر ان کے اپنے arena سے باہر نہیں نکل پاتا۔ ان کا شعر شارحین کی علمی اصطلاحات اور تشریحات کا ہمنوا تو بنا لیکن ادب و شعر کی اُس نسل سے کوئی رشتے استوار نہ کر سکا جو ان کے بعد ادبی تاریخ کے تسلسل کو آگے بڑھانے والی تھی''۔

اس کے باوجود کہ اقبال مذکورہ دونوں حلقوں میں بڑی حد تک معتوب رہے، اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ بن پڑا کہ اقبال نے اردو نظم کو فن کی دائمی قدروں سے وابستہ کیا اور مستقبل کی نظم کے لیے نئے فنی امکانات پیدا کیے۔ اپنے افکار کے لیے حسّی متبادل پیش کیے۔ پُرشکوہ اظہار، خطابت اور بلند آہنگی کے باوجود ان کے یہاں جس نوع کی متانت اور گہری سنجیدگی ہے وہ ان کی خود کلامی اور بحروں کی تہہ سے

اٹھنے والی سیال موسیقیت سے مس ہو کر ایک فقید المثال شعری و تخلیقی تجربہ بن جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہی لازوال حسن اور جادوئی وصف اکثر شاعروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سیاسی و سماجی ایجنڈے اور موضوعات و مسایل کی حد تک بلواسطہ طور پر اقبال کی بازگشت اکثر ترقی پسند شعراء کے تخلیقی شعور میں سنی جا سکتی ہے چنانچہ جوش، فیض، سردار جعفری، اور کیفی اعظمی وغیرہ سب نے اقبال کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھا ہے اور کسی حد تک ان سے فیضیاب بھی ہوئے ہیں۔ غیر ترقی پسند شعراء میں ن۔م۔راشد، عمیق حنفی اور شفیق فاطمہ شعراء وغیرہ کے ہاں اقبال کے فکری و فنی تسلسل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

میں نے یہاں صرف راشد اور فیض کی حد تک اقبال کے اثرات کو دیکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ یہ دونوں شعرا، گرچہ ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنی منفرد صلاحیتوں کے سبب اپنی الگ شناخت اور امتیاز رکھتے ہیں، البتہ ایک قدر مشترک ان دونوں، بلکہ تینوں شعراء میں بہت واضح ہے، وہ ان سب کا مغربی استعماریت کے خلاف ردعمل اور بغاوت ہے۔ راشد نے اقبال کی طرح اور غالباً انہیں کے زیر اثر نئے طرزِ احساس اور نئے اندازِ فکر کے ذریعہ پرانی اور روایتی زبان سے ایک نئے اور منفرد اسلوب کی تشکیل کی جو ان کی آزاد نظم کی رعنائی، دلکشی اور توانائی کی ضامن ہے۔ قدیم میں جدید روح جس سے راشد کا فن عبارت ہے، بالواسطہ طور پر اقبال کا ہی فیضان کہا جا سکتا ہے۔

راشد کے ہاں نوآبادیاتی نظام اور خصوصاً برصغیر میں برطانوی تسلط کے خلاف احتجاج کی لے تیز ہے، جبکہ اقبال نے پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی مغربی ریشہ دوانیوں کو ہدف بنایا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(ضربِ کلیم)

اقبال ہی کے مانند راشد بھی انسان کو بے باک اور خود آگاہ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ''ایران میں اجنبی'' میں وہ اسی طرح سامراج کی مصلحت کوش سیاست سے متنفر نظر آتے ہیں، جس طرح اقبال مسلم ممالک میں اہلِ مغرب کی چالوں سے حیران و پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ راشد کہتے ہیں ؎

بخارا سمرقند کو بھول جاؤ
اب اپنے درخشندہ شہروں کی
طہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کرلو،
اِن اونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کرلو
ہر اک بُرج و بارو پر اپنے نگہباں چڑھا دو،
تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہمان
تمہارے گھروں میں، (تیل کے سوداگر)

اقبال اور راشد کے ہاں بعض مذہبی اور اساطیری کرداروں کی حد تک بھی مماثلت کا گمان ہوتا ہے، لیکن ان کرداروں کے treatment میں دونوں کے نقطہ ہائے نظر اور تصورات میں واضح فرق بھی موجود ہے۔ مثلاً اسرافیل کا کردار دونوں کی نظموں میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے لیکن راشد کے ہاں مرگ اسرافیل پر فرشتوں کی گریہ وزاری اور زندگی کے حسن کا یکسر خاتمہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جبکہ اقبال کا تصور یکسر مختلف ہے ۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل
(بال جبریل)

تری دنیا کا یہ سرافیل
رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب
در پردہ تمام کارسازی (ضرب کلیم)

راشد کہتے ہیں ؎

مرگِ اسرافیل سے
دیکھتے رہ جائیں گے دنیا کے آمر بھی
زبان بندی کے خواب!
جس میں مجبوروں کی سرگوشی تو ہو
اس خداوندی کے خواب! (اسرافیل کی موت)

وقت اور زمانے کی چیرہ دستیوں کے خلاف یہ دونوں شعراء سینہ سپر نظر آتے ہیں اور اس صورت میں ذہنی بُعد اس قدر کم ہو جاتا ہے کہ دونوں پر ہم نفس ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ راشد کہتے ہیں ؎

بڑھو، تم بھی آگے بڑھو،
اجل سے ملو،
بڑھو، نُو تو نگر گداؤ
نہ کشکول دریوزہ گردی چھپاؤ
تمھیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں
اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساؤ!
بڑھو، بندگانِ زمانہ بڑھو بندگانِ درم
اجل، یہ سب انسان منفی ہیں،
منفی زیادہ ہیں، انسان کم
ہوان پر نگاہِ کرم! (تعارف: ایران میں اجنبی)

اس لحاظ سے راشد کی معروف نظم ''سبا ویراں'' بھی اپنے دلکش اساطیری اور تمثیلی اسلوب، زہر میں بجھے ہوئے نشتر اور تیکھے طنز کی حد تک وسیع تر معنی میں اقبال کی حکیمانہ سیاسی و سماجی بصیرت سے گہرا سروکار رکھتی ہے۔ اس کے ماسوا راشد کی نظم ''تیل کے سوداگر'' بھی شاعر کی روحانی زبوں حالی اور تادیب ذہنی کی بے حد موثر عکاسی کرتی ہے ؎

ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر شعاعیں
انہیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں!

راشد اور اقبال کے فکری و تصوراتی نظام کائنات میں مماثلت اور مغائرت کے مطالعہ کے دوران ایک اور پہلو جس کی طرف نظر جاتی ہے۔ وہ ان شعراء کا خدائے تعالیٰ کے ساتھ گستاخانہ رویہ ہے۔ گرچہ یہ موضوع بالکل اچھوتا اور نیا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اقبال کی وساطت سے اس میں تیکھا پن اور جارحیت کا اضافہ ہوا۔ جارحیت جو بغاوت کی شرطِ اوّلین ہے وہ اقبال کے ہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہے، چنانچہ وہ قادرِ مطلق سے صرف دو بدو مکالمہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس سے دست و گریباں بھی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں، بلکہ وہ خدا کے اوّلین باغی ابلیس کی جرأت و ہمت کی داد دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کے مقابلے میں راشد کے ہاں خدائے لم یزل کے تئیں ایک جذبۂ تحقیر ملتا ہے جو کسی طرح پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ خدا کو بے کار قرار دینا اور فرشتوں کے کاندھوں پر اس کا جنازہ نکالنا مغرب زدگی سے بھی کچھ آگے کی چیز ہے جس کا کوئی فنی یا عقلی جواز نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں فیض احمد فیض کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اپنے سیاسی نظریے اور معتقدات کی حد تک اختلاف کے باوجود اقبال کی بے پناہ خداداد تخلیقی صلاحیتوں اور فنی کسب و کمال کے ہمیشہ مدّاح اور معترف رہے ہیں ؎

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گذر گیا

کے ماسوا بھی فیض اور اقبال میں فکری و ذہنی مماثلت اور افتراق کی کئی صورتیں موجود ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے فکر و فن کی جن گزرگاہوں پر اپنے خونِ جگر سے چراغاں کیا انہی راہوں پر چل کر فیض اور ان جیسے کتنے لوگوں کو اپنی منزلوں کا سراغ مل سکا۔ فیض نے اقبال کی ڈگر پر چلتے ہوئے پرورشِ لوح و قلم کے کسی بھی مرحلے میں کلاسیکی سخنوری کی تابندہ روایت سے دست بردار ہونا پسند نہ کیا۔ ان کی نرم روی اور خوش گفتاری کو بالواسطہ طور پر اقبال ہی کے فیضان سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

مغربی استعمار کی مسلسل فتنہ سامانیوں نے ایشائی ممالک خصوصاً ہندوستان میں جس طرح معاشرتی و تہذیبی زبوں حالی اور سیاسی حشر سامانی کو پروان چڑھایا اس کے ذکر سے کلامِ اقبال کا بڑا حصہ بھرا ہوا ہے، چنانچہ تصویرِ درد کے یہ اشعار ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذّتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

مطلعِ شاعری پر فیض کی آمد کے بعد اور صبحِ آزادی کے طلوع ہو جانے کے باوجود بھی قسمت کی ستم ظریفی کا سلسلہ دراز ہی ہوتا رہا اور فیض کو بھی پایانِ کار سوز و ساز اور درد و داغ کی وہ میراث ملی جسے اقبال چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ فیض کہتے ہیں ؎

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پَر افشاں ہوئے تو ہیں
ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہم

(اگست ۱۹۵۲ء)

مذکورہ دونوں اقتباسات میں شدتِ احساس اور روحانی اضطرب کی ایک زیریں لہر صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ایک اور نظم ''تنہائی'' جو عنوان کی حد تک دونوں شعراء کی مزاجی یکسانیت کی نمائندگی کے ساتھ ان عظیم فنکاروں کے ذہنی و جذباتی رشتوں اور رویوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ ملاحظہ کیے جانے کے قابل ہے۔اقبال فرماتے ہیں ؎

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا
انجم نہیں ترے ہمنشیں کیا؟
یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند ، یہ دشت و در ، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ، پیارے پیارے
یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل !

اقبال زمانی تقدیم اور مکانی بعد کے سبب اپنی مذکورہ نظم جسے شب کا رزمیہ بھی کہا جاسکتا ہے، جہاں ختم کرتے ہیں، فیض وہیں سے اپنے ذہنی و تخلیقی سفر کا آغاز، اِس طرح کرتے ہیں ؎

پھر کوئی آیا دل زار، نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہو گا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
سو گیا راستے تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

دونوں تخلیقی فنکاروں کے آبگینۂ احساس میں اس لطیف فرق کے ساتھ کہ اقبال کا لہجہ رجائیت اور فیض حالات کے شدید جبر کے تحت نومیدی کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں، مجموعی طور پر مظلوم انسانیت کی سربلندی اور نجات کی فکر میں دونوں غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔

راشد اور فیض کے شعری ادراک پر اقبال کے کہیں خفی اور کہیں جلی ارتعاشات اور فیضان کے اس مختصر جائزے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تخلیقی کارگزاری میں خیالات کا توارد، معنوی تسلسل اور بازگشت کچھ ایسی غیر فطری اور حیرت افزا باتیں نہیں ہیں۔ ایک متن کے دوسرے پر اثر و نفوذ کی روایت قرن ہا قرن سے چلی آرہی ہے، فرق صرف شعری اسالیب اور لفظوں کے ساتھ تخلیقی اور غیر تخلیقی برتاؤ سے واقع ہوتا ہے۔

راشد اور فیض ہمارے عہد کے بلند قامت اور نظم کے نمائندہ شعراء ہیں جنھوں نے اقبال جیسے دیو قامت اور عظیم المرتبت شاعر کی خوشہ چینی کے بجائے ان کی زمینوں میں اگر فصل اگائی اور ان کی زمزمہ سنجی سے اپنا تخلیقی رشتہ استوار کیا تو اسے بھی دراصل اقبال کی عظمت اور فضیلت کے تئیں ایک مناسب خراج اور اعتراف ہی کہا جا سکتا ہے۔

کشمیر میں اقبال شناسی.....ایک مختصر جائزہ

(۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۰ء تک)

پروفیسر بشیر احمد نحوی

کشمیر کو قدرت نے یہ امتیاز اور اِعزاز بخشا ہے کہ یہ ہر عہد میں تاریخ ساز اور مردم خیز ثابت ہوا ہے۔ جو اَفراد اور خانوادے مختلف اَسباب وعلل کی بنا پر یہاں سے ملک کے اَطراف واکناف میں وقتاً فوقتاً ہجرت کر گئے تھے ان میں سے کچھ سیاست، شِعر وادب اور علومِ اسلامیہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمک اٹھے۔ چاہے وہ لولاب کشمیر کے علاّمہ انور شاہ لولابی مسعودی ہوں، جن کے بارے میں اِقبال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ انور شاہ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے''۔ پنڈت نہرو جن کے آبا علاقہ زینہ پورہ شوپیان سے اِلہ آباد میں ایک نہر کے کنارے سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے نہرو کہلائے، ورنہ وہ کشمیر کی مشہور ہندو گوت ''کول'' خاندان سے ہیں۔ اقبال نے تب کہا تھا اور اب بھی یہ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

آں بر ہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
پختہ کار و تیز بین و تیز ہوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامنگیرِ ماست
مطلعِ ایں اَختراں کشمیرِ ماست

اقبال کے آبا واجداد بھی جنوبی کشمیر سے تین سو سال پہلے سیالکوٹ ہجرت کر گئے تھے۔ اپنے آبا کے مرزبوم کے ساتھ شاعرِ مشرق کا جذباتی تعلق تادمِ زیست قائم رہا۔ وہ اپنے وجود کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے جسم کا تعلق کشمیر کی پھلواری سے، دل کا تعلق سرزمین عرب سے

اور زبان کا تعلق شیراز ایران سے ہے۔

تنم گلے زخیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز ونوا ز شیراز ست

اقبال کی شہرۂ آفاق شخصیت اور فکر ونظر کے ساتھ تقریباً ایک صدی پر محیط اہالیانِ کشمیر کی محبت وعقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عوامی سطح پر درجنوں کالونیوں، محلّوں، مسجدوں، بازاروں، گلیاروں، پن بجلی پروجکٹوں، اور صنعتی وتجارتی اداروں کے نام اقبال سے منسوب ہیں۔اور اسی طرح متعدّد اسکولوں، علمی اِداروں، لایبریریوں اور لیبارٹریوں کے نام بھی علامہ سے موسوم ہیں۔ سرکاری سطح پر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ اور سنٹرل لایبریری بھی علامہ اقبال کی ذات سے معنون ہیں۔

ہندوپاک کے اہم علمی مراکز اور شخصیات کی طرف سے ہر سال کوئی نہ کوئی کتاب اقبال کے فکروفن سے متعلق منظرِ عام پر آتی رہتی ہے۔کشمیر میں نامساعد سیاسی حالات کے باوجود گذشتہ دس برسوں میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کئی اہم کتابیں، مجموعۂ مقالات اور ''اقبالیات'' (سالانہ مجلّہ) کے نو شمارے چھپ کر آچکے ہیں۔حامدی کاشمیری کی کتاب ''اقبال کا تخلیقی شعور'' ۲۰۰۱ء میں عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ چھپ کر ادبی حلقوں میں دادوتحسین پاچکی ہے۔یہ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔ تنقیدی زاویہ نگاہ سے تحریر کئے گئے ان مقالات کے عنوانات یوں ہیں۔

۱۔ اقبالیاتی تنقید.....ایک جائزہ
۲۔ کلام اقبال تنقیدی طریقِ کار
۳۔ اقبال کی شعری حسیت کی شناخت
۴۔ اقبال: فکر ونظر کے آفاق
۵۔ فکر اقبال کی تخلیقی بازیافت
۶۔ اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام
۷۔ اقبال کا شعری عمل

۸۔ اقبال شناسی روح اقبال کے حوالے سے

۹۔ اقبال اور تعمیر آدمیت

۱۰۔ اقبال: اکیسویں صدی میں

اسی نوعیت کی دوسری اہم کتاب ''اقبال کی تخلیقیت'' انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کی گئی۔ اس کے مصنف ڈاکٹر قدوس جاوید ہیں۔ یہ کتاب سات مقالات پر مشتمل ہے اور اس میں حسب ذیل موضوعات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

۱۔ اقبال شناسی..... مفہوم و معیار

۲۔ تخلیقیت..... اسرار و رموز

۳۔ اقبال کی تخلیقیت

۴۔ اقبال کی تخلیقیت..... قاری اور قرأت

۵۔ اقبال کی تخلیقیت..... متن اور بین المتونیت

۶۔ اقبال کی تخلیقیت اور غزل

۷۔ اقبال کی تخلیقیت اور استعاراتی نظام

مذکورہ دو کتابوں کے مصنفین اُردو زبان و ادب کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں نے فکری صلابت اور تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے حامدی صاحب کی اقبالیات پر دو اہم کتابیں ''حرفِ راز'' اور ''آئینۂ اِدراک'' چھپ چکی تھیں۔

اقبال شناسی کی روایت کو زندہ رکھنے میں جن غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے تقسیم ہند کے بعد ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان میں آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ انکی خواہش کے مطابق ان کا کتب خانہ علامہ اقبال لایبریری کا گوشہ آزاد کی صورت میں موجود ہے۔ یونیورسٹی نے اس حُسنِ ادا کے لیے ''جگن ناتھ آزاد گولڈ میڈل'' دینے کا فیصلہ کیا ہے جو ہر سال اقبالیات میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو دیا جائے گا۔

آزاد صاحب کی وفات کے بعد اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ''جگن ناتھ آزاد شخصیت اور خدمات'' کے عنوان پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہوا۔ ریاست اور ملک کے بیس سرکردہ ادیبوں نے آزاد کی اقبال دوستی، ادب نوازی اور شعر و شاعری پر مفصل مقالات پیش کیے جن کو بعد میں ''فکرِ آزاد'' کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا گیا۔ دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۳ء میں راقم کی تین کتابیں منظر عام پر آگئیں۔

۱۔ ''مسائل تصوف اور اقبال''، ''اقبال..... عرفان کی آواز'' اور ''اقبال ایک تجزیہ۔'' تینوں کتابیں اقبال کے نظریۂ تصوف، وحدت الوجود، وحدت الشہود، نظریۂ عرفان و سلوک اور اقبال کے فکری سرچشموں سے متعلق ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ۲۰۰۰ء ۲۰۰۲ء میں اہم مقالات پر مشتمل دو کتابیں ''نفحاتِ اقبال'' اور ''اقبال کی تجلیات'' چھپ کر علمی حلقوں میں کافی پسند کی گئیں۔ اسی دوران وادی کے ایک ماہر تعلیم پروفیسر سید حبیب کو انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دو مانوگراف تحریر کرنے کی استدعا کی گئی، چنانچہ انہوں نے "Iqbal's Raptures Melodize Education" اور ''رازِ الوند'' تعلیمی نقطۂ نگاہ سے لکھ کر اقبال شناسی میں ایک قابل تحسین اضافہ کیا۔ معروف اُردو شاعر مرحوم حکیم منظور نے بھی اسی دوران انسٹی ٹیوٹ کی گذارش پر کالجوں کے طلبہ کے لیے ''اقبال..... ایک تذکرہ'' کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل کئی محققین جو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں نے اپنے تحقیقی مقالات کو چھاپ کر کشمیر میں فکرِ اقبال کی ترسیل میں قابل قدر حصہ ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کا مقالہ ''نظریۂ اجتہاد اور اقبال'' سید شبیر احمد بخاری کا مقالہ ''کلام اقبال کے اَعلام و مشاہیر'' ڈاکٹر فریدہ کاک کا مقالہ ''اقبال اور کشمیر'' اور ڈاکٹر ریاض توحیدی کے اقبال پر مضامین کا انتخاب ''جہانِ اقبال'' چھپ کر کشمیر میں اقبال شناسی کی روایت اور اشاعت میں اہم کارنامے تصور کیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق احمد مسعودی اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد یونیورسٹی کا مقالہ "Alghazali and Iqbal:-Their Perspective on Education" اور

ڈاکٹر نذیر احمد شیخ کا مقالہ ''اقبال اور سوشلزم'' بھی کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔مواد، زبان اور تقابلی مطالعات کے اعتبار سے موخر الذکر دو کتابیں گذشتہ دس برسوں میں کشمیر میں اقبالیات کے حوالے سے اہم کتابیں تصور کی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر مرغوب بانہالی کی اقبالیات پر دو کتابیں ''آدم گری اقبال'' اور ''اقبال کے روحانی فکری اور فنی سرچشمے'' وجاہت پبلیکیشنز حضرت بل سرینگر کے اہتمام سے بڑے دیدہ زیب انداز میں چھپی ہیں۔ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے پروفیسر مرغوب صاحب کی اقبال شناسی اور اقبال سے عقیدت مندی کی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء میں کشمیر میں ایک اہم سیاسی و دینی رہنما سید علی گیلانی صاحب کی کتاب ''اقبال۔روح دین کا شناسا'' دو جلدوں پر مشتمل تعمیر ملت مائسمہ سرینگر کے اہتمام سے چھپی ہے۔سات سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب اقبال کے اسلامی، انقلابی، ملی اور درد و عشق سے لبریز اُردو اور فارسی اشعار کی عالمانہ تشریح و توضیح کا ایک مرقع ہے۔اس کتاب کی پیشانی پر اقبال کا یہ شعر درج ہے۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

۲۰۰۲ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی ڈائریکٹر شاہ ھمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کشمیر یونیورسٹی کی تحریر کردہ کتاب ''خطباتِ اقبال کا تنقیدی جائزہ'' (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں) شائع کی گئی۔فاضل مصنف نے اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ خطبات اقبال پر اُردو میں لکھی گئی بعض تصانیف کا تنقیدی جائزہ۔
۲۔ اقبال کا تصورِ نبوت اور مسلم فلاسفہ و متکلمین۔
۳۔ اقبال کے تصورِ زمان و مکان کا ایک تحقیقی جائزہ۔

ریاست جموں و کشمیر کے معروف صحافی اور شاعر جناب غلام نبی خیالؔ کی کتاب ''اقبال اور تحریکِ آزادی کشمیر'' ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔فاضل مصنف نے بڑی عرقریزی سے اقبال اور

کشمیر کے حوالے سے جملہ مواد کو اکٹھا کیا ہے۔ اور کچھ متنازع امور کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ خیال صاحب نے اقبال کی بعض فارسی نظموں کا بہت ہی عمدہ منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ خاص طور پر حُدِی (نغمۂ ساربانِ حجاز) کا۔

ریاست کے کئی نامور ادیبوں ناقدوں اور شاعروں کے نثری وشعری مجموعے گذشتہ برسوں میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ شائع ہوئے ہیں جن میں اقبال کے حوالے سے کوئی نہ کوئی مضمون شامل ہے۔ سید رسول پونپر کی تین کتابیں ''رشحاتِ ایام'' ''آبگینے'' اور پیش آہنگ'' انتہائی محنت، خلوص اور اعلیٰ ادبی معیار سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ریاستی اور قومی سطح کے انعام واکرام کی مستحق ہیں۔

گذشتہ دس برسوں میں کشمیر کے کثیر الاشاعت اُردو اور انگریزی اخبارات میں فرزندِ کشمیر اقبال کی شخصیت، عہد، حالات، حیات، کارناموں، اور کشمیر کے ساتھ انکی نسبتوں پر ہزاروں چھوٹے بڑے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کشمیر کی معروف روحانی شخصیت حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ اور اقبال کے اشعار کا ایک تقابلی مطالعہ جناب اسداللہ آفاقی نے کیا ہے۔

ریاست میں انتہائی ناموافق سیاسی حالات کے باوجود اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی گذشتہ برسوں میں کافی متحرک رہا اور چھوٹے بڑے سمینار اور ادبی محافل کا انعقاد کرتا رہا۔ ایک لاکھ سے زائد اشعار کے رنگین Stickers لداخ سے لیکر کشتواڑ کے آخری دیہاتوں تک پہنچائے گئے۔ اور اس طرح وادی کے کالجوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں فکر انگیز اور نور بصیرت کی آرزو سے معمور اشعار در و دیوار پر نصب کئے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ کی تیس سال کی علمی کاوشوں کا احاطہ جناب ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے ''جامعہ کشمیر اور اقبالیات'' لکھ کر کیا ہے۔ یہ تحقیقی پروجیکٹ ڈاکٹر بٹ نے دو سال کے عرصے میں مکمل کیا اور ۵۲۹ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب انسٹی ٹیوٹ کے یوم آغاز سے لیکر آج تک کی تمام سرگرمیوں کا دائرۃ المعارف ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر کبیر احمد جائسی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ماہانہ ترجمان ''کانفرس گزٹ'' کے مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں لکھا ہے۔

''ڈاکٹر بدرالدین بھٹ کی اس کاوش کو بجا طور پر اقبال انسٹی ٹیوٹ کا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس تالیف کی ابتدا کشمیر کے تاریخی پس منظر کے مطالعے سے کی ہے.....اس مطالعے میں ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کے تدریسی عملے کی حیات اور کارناموں کی تفصیل رقم کردی ہے۔ سرور صاحب ہوں یا دوسرے اساتذہ، ان کے بارے میں کہیں نہ کہیں کچھ مواد مل جاتا ہے۔لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی پر کام کرنے کے باوجود صبیح احمد کمالی مرحوم کے کوائف حیات سے بیشتر لوگ ناواقف ہیں۔ڈاکٹر بھٹ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کمالی صاحب کے بارے میں آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا مواد جمع کردیا ہے۔جسکی مدد سے لوگ ان کے بارے میں کچھ جان سکیں گے۔''

غلام نبی گوتی کی شاعری پر اقبال کے اثرات

پروفیسر شہاب عنایت ملک

ریاست جموں و کشمیر صدیوں سے بلند پایہ سخن وروں کو جنم دیتی رہی ہے اور دیتی رہے گی۔ وجہ یہ ہے کہ قدرت نے خطۂ کشمیر کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے۔ اسے بلند پہاڑیوں اور فلک بوس چوٹیوں سے محفوظ کیا ہے تا کہ قدرت کے بنائے ہوئے اس حسین بت کی رعنائیاں اس قدر سحر آفرین ہوں کہ سادہ سے سادہ ذہن رکھنے والے افراد بھی اس پر فریفتہ ہوں۔ گلاب کا حسن اور گلِ لالہ کا جام شراب پیش کرنا کسے متاثر کئے بغیر رہ سکتا ہے اور یہاں خالقِ کائنات بھی اپنے کرشموں پر ناز کرتا ہے۔ اس دلکش ماحول میں اعلیٰ پایہ کے شاعر اور ادیب پیدا نہ ہوں تو اور کہاں ہوں۔ اس سرزمین خاک سے چکبست، اقبال اور سرشار اٹھے۔ غنی نے فارسی شاعری کو اپنی غزلوں سے غنی کر دیا۔ مہجور نے اپنی پُر گداز اور درد بھرے نغموں سے کشمیری زبان کے مردہ جسم میں روح پھونک دی۔ اقبال نے قوم کو اپنے کلام سے خود شناس بنا دیا۔ اسی سرزمین کے بھدرواہ خطے، جسے کشمیر کی دلہن بھی کہا جاتا ہے، کو بھی قدرت نے بے پناہ حسن سے نوازا ہے۔ چھوٹا کشمیر کہلانے والی یہ دلکش وادی ہمیشہ سے ہی شاعروں اور ادیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ ان شعراء نے کشمیری اور اردو ادب کی بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ ان شخصیات میں رسا جاودانی، دیوانہ بھدرواہی، وفا بھدرواہی، بشیر بھدرواہی، کنول نین نکہت اور الیاس تنویر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے اس قافلے سے غلام نبی گوتی کا بھی تعلق ہے جنہوں نے ریاستی شعر و ادب کی بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔

غلام نبی گوتی بھدرواہ کے معروف گونی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عدلیہ میں بحیثیت کلرک بھرتی ہوئے۔ یہ نوکری جب راس نہ آئی تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے متمنی ہوئے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وکالت کے پیشے کو اپنایا۔ بھدرواہ اور ڈوڈہ میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑنے کے بعد جموں میں وکالت شروع کی۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ان کا شمار جموں و کشمیر کے اعلیٰ وکلاء میں ہونے لگا۔ اپنے انتقال تک وہ اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ اردو زبان و ادب سے گہری محبت تھی۔ علامہ اقبال سے بچپن سے ہی فکری اور جذباتی طور پر وابستہ

رہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں یوں کیا ہے:۔

''میری اپنی ذاتی روائد حضرت علامہ سے ایک غیر مبہم باطنی وابستگی سے ممنون ہے جس کا اجمالی بیان یوں ہے کہ میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ دوپہر کا وقت تھا، میں اپنے آبائی قصبے کے چھوٹے سے بازار کی پتھر کی سلوں سے بنی سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک دکان پر جمع کچھ بزرگوں سے کہتے سنا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب وفات پا گئے ہیں۔ خدا جانتا تھا کہ میں تب آپ کے نام سے بھی واقف نہ تھا مگر نہ جانے کیوں میرے دل کو اس خبر سے ایک گہرے صدمے کا احساس لاحق ہوا جس کا اثر آج تک باقی ہے۔ مابعد کی وارداتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج سوچتا ہوں کہ شاید یہ میرا پہلا روحانی تجربہ تھا''۔

جب گوتی سولہ سال کے ہوئے تو اقبال کی چند تصانیف کا مطالعہ کیا پھر جب انہیں اپنے مرحوم چچا کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں حضرت پیر جماعت علی صاحب کے ہاں علی پور سیداں جانے کا موقع ملا تو پیر صاحب کی اقبال کے تئیں محبت اور بے پناہ احترام کو دیکھ کر گوتی کے دل میں اقبال کے تئیں اور زیادہ محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

''علی سیداں پور میں جب پیر صاحب نے علامہ اقبال کو موضوعِ سخن بنایا تو اقبال کے تئیں جس احترام کا وہ اظہار کر رہے تھے میں نے آج تک اقبال کے کسی بھی شیدائی کو اس احترام اور عقیدت سے ان کا ذکر کرتے نہ سنا ہے اور نہ دیکھا ہے۔ یہ واقعہ میری زندگی کا نہایت اہم واقعہ تھا۔ علی پور سیداں کا یہ سفر اور مردِ قلندر کا مجھ ناچیز سے بے پناہ شفقت کا اظہار اور حکیم الامت کا ذکر چھیڑنا بے مقصد اور معمولی اتفاق نہ تھا جس کا ایک ایک تاثر اب نشانِ خاطر بن چکا ہے''۔

جیسا کہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ گوتی صاحب اقبال کے زبردست شیدائی تھے، علامہ کی گہری چھاپ ان کی شاعری پر بھی ہے اور ذاتی زندگی میں بھی انہوں نے علامہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ اس بات پر انہیں فخر بھی حاصل ہے اسی لئے وہ اپنے آپ کو فرزندِ اقبال کہتے ہیں ؎

پھیلائے گا جو نکہت یثرب کو عجم میں
کہتے ہیں کہ کشمیر میں اک پھول کھلا ہے

کیا پوچھتے ہو شاعرِ کشمیر کی نسبت
اقبال کا فرزند ہے تلمیذِ خدا ہے

گوتی کی شاعری کا آغاز یوں تو طالب علمی کے زمانے سے ہی ہوتا ہے لیکن وہ شہرت کے خواہاں نہیں تھے۔ ادبی حلقوں میں وہ تب معروف ہوئے جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ارمغانِ کشمیر'' شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے دو اور مجموعے شائع ہوئے۔ ''زمزم سے جہلم تک'' اور ''گلبانگِ کاشمیر''۔ ''گلبانگِ کاشمیر'' کو ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے محمد اسلم گوتی نے ایک دیدہ زیب کاغذ پر بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرایا۔ گوتی نے جو کچھ لکھا اردو میں ہی لکھا۔ انہوں نے اپنی پہلی غزل ۱۹۶۴ء میں کہی جب انہیں خواب میں علامہ اقبال کی زیارت نصیب ہوئی۔ اپنی ایک اور غیر مطبوعہ تحریر میں وہ رقمطراز ہیں۔

''ماہ اپریل ۱۹۶۴ء کا واقعہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال کی زیارت رویائی سے یہ ناچیز مشرف ہوا۔ اس مشاہدہ کا اجمال کچھ اس طرح ہے کہ مجھے مقامی تھانہ پولیس سے بلاوا آیا۔ وارد ہوا تو ایک صاحب کو پنجابی دستارِ طرہ دار، کالی اچکن اور شلوار میں ملبوس کرسی پر تشریف فرما دیکھا۔ بھرا بھرا پُر وقار چہرہ، سیاہ گھنی مونچھیں۔۔۔۔ جیسے کسی کی آمد کے منتظر ہوں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو موصوف تبسم فرماتے ہوئے متوجہ ہوئے۔ میں نے داخل ہوتے ہی سلام عرض کیا۔۔۔۔ ''وعلیکم السلام'' کہکر اپنے داہنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے سروں کو ملا کے مخلوطی شکل میں میری طرف کر کے مجھے بھی ایسا کرنے کو فرمایا۔ میں نے تعمیلِ حکم کی تو موصوف نے کچھ پڑھ کر میری انگلیوں پر دم فرما کر اپنی مونچھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم بھی اسی طرح مونچھیں رکھا کرو۔ میرے دل میں تعارف کا خیال ہی پیدا ہوا تھا کہ جیسے میرے استعجاب کو بھانپتے ہوئے مسکراتے ہوئے فرمایا ''ہم اقبال ہیں''۔ یہ سن کر قلبِ ماہیت کی جو کیفیت میرے دل و دماغ پر طاری ہوئی ناقابلِ بیان ہے۔ معاً خواب سے بیدار ہوا تو شرابور جسم پر ایک خفیف سا لرزہ طاری تھا اور میری زبان پر یہ مصرعہ تھا۔

ع.....باطل کے ہر سوال پر ہوتے ہیں رضامند

معمولی سی محنت کے ساتھ دوسرا مصرع بھی وارد ہو گیا اور شعر اس طرح سے بن گیا ؎

باطل کے ہر سوال پر ہوتے ہیں رضا مند
نومید ہو گئے ہیں خلایق سے خدا وند

مندرجہ بالا اقتباس نقل کرنے کا میرا مقصد یہاں یہ بھی ہے کہ سامعین کو اس بات سے بھی روشناس کرایا جائے کہ جناب گوئی کی علامہ اقبال سے نہ صرف ذہنی وابستگی تھی بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کی بہت زیادہ تقلید بھی کی۔ گوئی نے اپنی مونچھوں کا انداز زندگی بھر ویسا ہی رکھا کہ جس طرح علامہ اقبال کی مونچھوں کا انداز تھا اور علامہ کی طرح ہی وہ ہٹے کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ کبھی کبھی اچکن اور شلوار بھی پہنتے تھے۔

گوئی ایک فلسفیانہ ذہن کے مالک تھے اسی لئے وہ کائنات کے تمام اسرار و رموز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اخلاقیات اور انسانیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ علامہ اقبال کی طرح انہیں بھی ملت کا غم تھا۔ وہ قوم کی اصلاح بھی چاہتے تھے، جس طرح علامہ کی شاعری کا ماخذ قرآن حکیم تھا اسی طرح گوئی بھی یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ دکھ درد کا علاج قرآنی آیات میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو قرآنِ حکیم کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ؎

اس شخص کا اسلام کا سرمایہ ہی کیا ہے
پڑھتا ہے نہ سنتا سمجھتا ہے قرآن

علامہ اقبال کو قومی شاعر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں اسلام کے تصورات سے آشنا کیا اور اپنی ساری زندگی اسلام، اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت اور مسلمانانِ ہند و پاک کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی۔ وہ ایک بڑے فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ انہوں نے دنیا کے اہم فلسفیوں کا مطالعہ کر کے نہایت گہرائی اور بصیرت کے ساتھ اپنی شاعری کے ذریعے اسلام کے نظریات کو پیش کیا ہے اور اس کے ہمہ گیر اثرات ہماری قوم اور قومی و ملی زندگی پر مرتب ہوئے۔ کلام اقبال کی سب سے بڑی خوبی جو انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکر و فلسفہ کو شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیغام کی صورت میں پوری دنیا کے سامنے رکھا۔ اسی لئے ہر فرد میں اقبال کا کلام

مقبول ہے اور اس سے متاثر بھی ہوا۔

غلام نبی گوتی ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنہوں نے اقبال کے تمام تصورات کو قبول کیا ہے اور ان تصورات پر خود بھی قلم اٹھایا ہے۔ عظمت اور فضیلتِ انسانی علامہ کی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ انسان کی عظمت کے تصوارات کو پیش کیا ہے اور اس کی جدوجہد اور کامیابی و کامرانی کے نغمے گائے ہیں۔ وہ انسان کو فرشتوں سے بھی زیادہ عظیم سمجھتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں انسان کو مخاطب کیا ہے جس کی بنا پر ان کے کلام میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

ے یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اس ضمن میں غلام نبی گوتی کا یہ شعر دیکھئے:

ے ہندو نہ یہودی نہ مسلماں کی نظر سے
ہم دیکھتے ہیں آپ کو انسان کی نظر سے

گوتی کا عقیدہ توحید نہایت راسخ تھا انہیں اللہ اور اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ اور ایمان تھا۔ قرآنِ پاک سے انہیں بے حد رغبت تھی۔ قرآنِ حکیم کو اول اور آخر تصور کرتے تھے۔ علامہ اقبال کے مطالعے میں بھی سب سے زیادہ رہنے والا صحیفہ قرآنِ پاک ہی تھا۔ قرآن کی تلاوت وہ رقعت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ تلاوت کرتے کرتے اشک رواں ہو جاتے اور رقت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ عشقِ رسول ﷺ میں فنا ہو چکے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک عشقِ رسول ﷺ نہ ہو اللہ کی ذات تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ حضور پاک ﷺ کو باعثِ ایجادِ عالم کہتے ہیں۔

ے نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یٰس وہی طٰہٰ

اس خیال کو گوتی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

آفرینش کی مراد عشق رسولؐ
تا قیامت زندہ باد عشقِ رسولؐ

عالمِ لاہوت کی تسخیر ہے عشقِ رسولؐ
عالمِ ایجاد کی توقیر ہے عشقِ رسولؐ

علامہ اقبال کے ہاں عشقِ رسولؐ کا جذبہ اس شعر سے عیاں ہوتا ہے ۔

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

گوتی بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو شخص حضور پاکؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا وہی شخص انسان کہلانے کا مستحق بن سکتا ہے اور انسان اور انسانیت کا ہمدرد ہو سکتا ہے۔

یہ اشعار دیکھئے:

حدیث ترسیل و قرآن کی تلاش مجھے
خلوص و جرأت و ایمان کی تلاش مجھے
حضورؐ و غیب کی شائستہ ذات ہو جس کی
رہے گی ایسے مسلمان کی تلاش مجھے

گوتی کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد اقبال زرگر اپنے ایک مضمون ''ان کی باتیں جب یاد آئیں'' میں یوں رقمطراز ہیں۔

''گونی شاعرِ مشرق اقبال سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اقبال کی کامیاب تقلید بھی کی ہے اور انہیں اپنا مرشد و ہادی بھی مانا۔ اقبال کی طرح گوتی بھی اسلام کی آفاقیت کے قائل اور پیغمبر اسلامؐ کے عاشق و شیدا تھے'' علامہ اقبال جنہیں قرآن کا شاعر کہا گیا ہے انہوں نے بعض اشعار میں قرآنی آیات بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً

آبتاؤں تجھ کو رمزِ آیہ اِنَّ الْمُلُوْك
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادو گری

گوتی کے کلام میں بھی قرآنی آیات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً:

کسی کو یاد نہیں، کُل مَن عَلَیْھَا فَان

اگر چہ حرفِ اجل کندہ مقبروں پر ہے

مغربی تہذیب وتمدن کی اقبال نے کڑی تنقید کی ہے اور وہ اس تہذیب کے سخت خلاف ہیں۔ جس نے بنی آدم کو داؤ پر چڑھانے کے لئے قمار خانہ بنا دیا ہے۔

؎ جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

گوتی کہتے ہیں کہ اس تہذیب میں بڑی چمک دمک ہے لیکن اندر سے یہ کھوکھلی ہے اگر چہ اس کا رویہ دوستانہ ہے لیکن یہ سب سے بڑی دشمن ہے، کہتے ہیں

؎ مختصر افرویشیا سے اہلِ مغرب کا سلوک

دشمنی تہذیب ان کی دوستانہ سا مزاج

اپنی شاعری میں جہاں گوتی مشرقی روایات کی اعلیٰ اقدار کی بات کرتے ہیں تو وہیں دوسری طرف مغربی تہذیب کی خرابیوں کی طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید قوم وملت کے زوال کا سبب بن رہی ہے۔ اپنی زیادہ تر شاعری میں ایک طرف جہاں انہوں نے کشمیر پر اپنی پوری توجہ صرف کی ہے تو دوسری طرف اسلام جیسے عظیم مذہب کی عظمت کو بھی ابھارا ہے۔ کشمیر میں انتشار وافراتفری کو وہ مذہب سے غفلت برتنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی طرح ہی گوتی بھی مذہبِ اسلام کی عظمت کو دہرا کر کشمیری عوام کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔

؎ ارض کشمیر کے مسلماں کو

فکر و انداز بوترابؓ آئے

کتنی گمراہ تھی یہ قوم کہ جب

اس طرف سبطِ آنجنابؐ آئے

پھر یہی خاکِ مردہ زندہ ہو

کوہ باراں سے گر سحاب آئے

علامہ اقبال بھی مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تمہارے ہاتھ میں اس وقت عزت وجلال اور شان وشوکت نہیں ہے تو یہ تمہاری غفلت کا ثمرہ ہے جب تم نے اسلامی اصول ترک کردئے تو دنیا میں پریشان، منتشر اور آوارہ ہو گئے۔

اے دُرِ تابندہ ، اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا
اب نوا پیرا ہے کیا، گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنّم ، نغمہ بے موسم ترا

عشق وعقل کے تضاد پر علامہ اقبال نے بہت کچھ لکھا ہے۔ عشق کی عظمت کو بیان کر کے انہوں نے عقل کو کمزور ٹھہرایا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ عقل عشق کو طرح طرح کے خدشات سے خوف دلاتی ہے۔ وہ اسے ہر قدم پر روکتی ہے لیکن عشق اس کے مشوروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کی تیغ جگردار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

گوتی بھی اپنے کلام میں عشق کو عقل کے مقابلے میں بلند درجہ عطا کرتے ہیں۔ وہ عشق کو حسن ازل کی آبرو قرار دیتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

عشق ہے حسن ازل کی آبرو
عقل ہے لات و حُبل کی جستجو
عقل کرواتی ہے غم میں خودکشی
رنج ہائے عشق رشکِ سر خوشی

جمہوری نظام کو اقبال ساحری اور دھوکا بازی قرار دیتے ہیں جس میں فتنہ وفساد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں، وہ اصل میں ملوکیت ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ جمہوریت نہیں بلکہ ظلم وستم اور مطلق العنانی کا دیو، جمہوریت کے لباس میں لوگوں کے سامنے ناچ رہا ہے لیکن عوام اسے آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہیں۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

گوئی بذاتِ خود جمہوریت کے پاسدار ہیں لیکن اس نظام کی وجہ سے انسان کو جن حالات کا شکار بنایا جا رہا ہے وہ شاعر کو صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ انہیں سیاست دانوں کی عیاری وعوامی پریشانی تڑپا دیتی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

کر گئے تم طرزِ جمہوری کو آخر بے نقاب
مردہ بادائی فرقہ وارانہ تعصب ذات پات

ضبط تولید و قیود ازدواج و خواہشات
تین بچے ایک بیوی داشتائیں پانچ سات

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں:

جمہوریت کے اندر اس وقت بھی رواں ہے
اک قائدِ منافق، روحِ نظام فاشی

اقبال نے اپنے فلسفیانہ نظریات میں تصورِ زماں ومکاں کو بہت اہمیت دی ہے۔ زماں کا تصور مکاں اور مکاں کا تصور زماں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ زماں ایک حقیقت ہے اور زندگی زماں میں ایک مسلسل حرکت کا نام ہے۔ زماں کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ اختتام۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زمانے کی حقیقت سے ہر کوئی واقف نہیں ہو سکتا اور جس نے زماں کو نہیں سمجھا، اس کی قدر نہیں کی، زمانہ اسے بھلا دیتا ہے۔

ے تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلہ ٔ روز و شب صیرفئ کائنات

گوتی کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اقبال کی طرح وہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے وقت کو نہیں سمجھا اور جو وقت کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا اسے زمانہ بھلا دیتا ہے۔

ے جو لوگ ہیں نا واقف رفتارِ زمانہ
گرتے ہیں وہی گردشِ دوراں کی نظر میں

علامہ اقبال نے بعض اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے پس پردہ بہت سے واقعات پوشیدہ ہیں۔ اُن کی علامتی خصوصیات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے:

ے شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید" تیرا جمال بے نقاب

یہ خصوصیت گوتی کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

ے فکر سے محروم ہے گونی کی تاریخ پیرانِ حرم
کچھ نہیں لکھا گیا ہے بوذرؓ و مقدادؓ پر

گوتی نے بعض نظمیں اور غزلیں اس انداز سے کہی ہیں کہ ان کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ ہم کلام اقبال کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس کی مثال ذیل کے اشعار میں دیکھتے ہیں:

ے خودی کا سرِ نہاں لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
خودی ہے تیغ فساں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
----(اقبال)

نہیں ہے آہ وفغاں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
نہ شورِ نوحہ گراں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
نہیں ہے ماتمِ جاں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ
شکوہ روحِ رواں، لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللـــہ

----(گوتی)

گوتی نہ صرف حساس طبعیت کے مالک اور اعلیٰ پایہ کے دانشور تھے بلکہ نہایت جذباتی مسلمان، قانون ساز، تاریخ، کلچر اور تمدن کے نگہبان اور سب سے بڑھ کر ایک قابلِ فخر شاعر بھی تھے لیکن ان کی شخصیت کے پہلو کتنے ہی لامتناہی ہوں ان کا افکار کا اقبال سے فیض پانا اور ریاست کے سیاسی وسماجی حالات سے ان کے دل ودماغ کا متاثر ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

محمد یوسف ٹینگ نے ان سے متعلق واضح الفاظ میں لکھا ہے:۔

''میرے خیال میں وہ جموں وکشمیر میں طرزِ اقبال کے آخری سخنور ہیں''

چراغ حسن حسرت کے بھانجے محمود الحسن بھی ''گلبانگِ کاشمیر'' کے تبصرے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''یقین جانئے برِصغیر ہندوپاک کے نامور شعراء میں حضرت علامہ اقبال کی تصانیف کے بعد گونی صاحب مرحوم کی تصنیف ''گلبانگِ کاشمیر'' نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میں نے حرف بہ حرف کتاب کا مطالعہ کیا دل ہی دل میں جناب گوتی صاحب کے احساساتِ قلبی پر سر دھنا اور بالاخر اس نتیجے پر پہنچا کہ خدا نے اقبال کے بعد گوتی صاحب کی شخصیت میں ایک اور اقبال عطا کیا ہے۔''

گوتی کی شاعری سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موصوف علامہ اقبال سے بہت حد تک متاثر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور نظر کشمیر کے ساتھ ساتھ تمام دنیا پر تھی جس طرح اقبال کا عہد عہدِ غلامی تھا اور جس کا احساس اقبال کو شدت کے ساتھ تھا اسی مانند گوتی کا عہد بیزاری اور سیاست کے معیارات سے نالاں ہونے کا دور تھا۔ جس کا نوحہ گوتی تمام عمر پڑھتے رہے کیونکہ ریاستِ جموں وکشمیر کی آئینی حیثیت جتنی پیچیدہ رہی ہے اتنی ہی صورتِ حال کشیدہ بھی رہی ہے۔ یہی تمام باتیں گوتی کے دل ودماغ کو متاثر کرتی ہیں۔

ے سانحہ بے گناہ مسائل کا
فیصلہ حکمران عادل کا
سرحدیں شہر کے گلی کوچے
ہر طرف زور و شور باطل کا

ریاست کی کشمکش کے اس عہد میں ان کے سیاسی نظریات اور عقائد انہیں ایک جذباتی مسلمان اور علامہ اقبال سے روحانی فیض پائے ہوئے ایک ایسا مردِ مجاہد ثابت کرتے ہیں جو جانتے تھے کہ:

ے ہوس پرست بن گئے وطن پرست رہنما
وصول کر لیا گیا دل و جگر کا خون بہا
خدا گواہ خلق پر بلادِ ہند و پاک
ستم سماج داد ہے غضب نظامِ مصطفٰے
دل و نگاہ میں کوئی مقام تھا نہ راستہ
جو میرِ کارواں ملا تو صاحبِ نظر نہ تھا

مختصراً یہ کہ گوتی نے شاعرِ مشرق کی بھرپور تقلید کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اقبال کے طرز کو اپنانے اور اسے کامیاب بنانے میں اُنہوں نے خطۂ چناب میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے میں اپنے اس مضمون کو محمد یوسف ٹینگ کے اس اقتباس پر ختم کر رہا ہوں جس میں انہوں نے گوتی کے بحر کا اقبال کے طوفان کی لپیٹ میں آنے کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو محمد یوسف ٹینگ کا یہ اقتباس:

''اقبال نے جب اپنے نغمۂ جبرئیل آشوب کے بادبان کھولے تو اردو کا سارا خیمہ تہس نہس ہو گیا۔ اسی ہماہمی اور ہنگامے میں اردو کی مستند شعری روایات کا جو حال ہوا اس کا نقشہ خود علامہ اقبال کے اس مصرے سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا''۔

ع..... آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ بہت سے شاہیں بچوں کی طرح گوتی بھی بحرِ اقبال کے اس طوفان کی لپیٹ میں آ گئے۔ وہ اقبال کے خیالات اور لہجے کی بازگشت تو کرتے ہیں لیکن اس کی بازآفرینی اور بازتخلیق شاید ان

کے زمانے میں ممکن نہیں تھی مگر ان کے حال مستی کے قربان جایئے کہ وہ اپنے الگ تھلگ جزیرۂ سخن میں ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نظمیں اور غزلیں اقبال کے آخری مجموعہ ہائے کلام ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' کا تسلسل اور توسیع لگتی ہیں۔

عرب کے قدیم شاعروں کی طرح وہ بھی اقبال کی ہی لے میں رجز بلند کرتے ہیں۔

ے از نالۂ مرغِ چمن از بانگ اذاں خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں ، خوابِ گراں خیز

اقبال کی پہلی فارسی تصنیف

''اسرارخودی'' کا منظوم کشمیری ترجمہ از غلام احمد نازؔ کولگامی

پروفیسر تسکینہ فاضل

جموں وکشمیر میں اقبال شناسی کا موضوع چونکہ اپنے اندر خاصی وسعت اور تنوع لئے ہوئے ہے، اِس لئے اِس کا احاطہ کرنے کے لئے کئی کتابوں کی تصنیف وتالیف درکار ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں کلام اقبال کے کشمیری تراجم میں سے اُن کی پہلی فارسی تصنیف مثنوی ''اسرارخودی'' کے منظوم کشمیری ترجمہ پر بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجمہ پر بات کرنے سے پہلے اصل تصنیف یعنی ''اسرارخودی'' پر مختصراً اظہارِ خیال کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مثنوی ''اسرارخودی'' اقبال کی وہ اجتہادی تصنیف ہے جس میں اُنہوں نے لفظ خودی کو، جسے عام طور پر غرور، تکبر اور نخوت کے منفی معنوں میں استعمال کرکے اِسے فنا کردینے پر زور دیا جاتا رہا ہے، ایک باقاعدہ اور مُثبت اصطلاح کے طور پر برت کر اِس سے شعورِ ذات، احساسِ نفس جیسے معانی مراد لئے گئے ہیں۔ اقبال فرد سے اپنے اندر کی مخفی صلاحیتوں کی شناخت کرنے اور پھر انہیں قانونِ ایزدی کے تابع کرکے بروئے کار لانے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح خودی کو مسلمان کردیا جاسکتا ہے۔ ورنہ وہ شیطنت بن جاتی ہے۔ اقبال نے خودی کے تین مراحل تجویز کئے ہیں ۱۔ اطاعت ۲۔ ضبطِ نفس ۳۔ نیابتِ الٰہی۔ فرد پہلے دو مرحلوں کو طے کرتے ہوئے نیابتِ الٰہی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے، خودی کو تقویت یا استحکام عطا کرنے کے لئے عشقِ رسولؐ اختیار کرنے پر بے پناہ زور دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مثنوی اسرارخودی ایک نہایت وسیع پس منظر کے تحت تصنیف کی ہے۔ اُس دور کی عالمی صورتِ حال بالخصوص اُمتِ مسلمہ کے انحطاط کو نظر میں رکھتے ہوئے اقبال اُنہیں دوبارہ اپنی عظمتِ رفتہ سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے، ساتھ ہی عالمگیر سطح پر ایک صالح اور برتر معاشرہ کے قیام پر غور وفکر کررہے تھے جسے ممکن بنانے کی خاطر اُنہیں اسلام کارگر ترین اور موثر ترین وسیلہ نظر آیا، کیونکہ مذہب اسلام، مذہبِ انسانیت ہے، جس میں ذات پات، رنگ ونسل اور جغرافیائی حدود وقیود کے تمام امتیازات بے معنی ہیں۔

اِسطرح رفتہ رفتہ پوری دُنیا پر اقبال کے آفاقی پیغام کی اہمیت واشگاف ہونے لگی۔ سب سے پہلے عربی کے ایک عالم اور انگریز مستشرق رینالڈ اے نکلسن (R.A. Nicholson) نے اقبال کی اس اجتہادی تصنیف سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو کر اقبال سے اس کے ترجمے کی اجازت چاہی جو اُنہیں مل گئی۔ اُن کا منظوم ترجمہ اسرارِ خودی انگریزی زبان میں "Secrets of Self" کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ انگریز مستشرق نے ترجمہ پر ایک فکر انگیز دیباچہ تحریر کر کے اقبال کے افکار کی اہمیت کا احساس دلایا۔ نکلسن کا یہ ترجمہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ بعد ازاں کئی دوسری زبانوں جیسے اُردو، انڈونیشیائی، عربی، پشتو، سندھی اور کشمیری میں بھی اس کے کئی ترجمے[1] شایع کیے گئے۔

فردوس بروئے زمین کشمیر، اقبال کے آبا و اجداد کا وطن رہا ہے۔ اِس جنت نظیر خطّے اور یہاں کے محکوم عوام کے مختلف مسائل کے تئیں اقبال کی دلی ہمدردی کا احساس اُن کے کلامِ منظوم و منثور کے علاوہ اُن کی عملی کوششوں سے ہوتا ہے۔ اقبال کشمیر کمیٹی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں اور مظلومین کشمیر کی خاطر چندہ جمع کرنے کی مہم میں بھی برابر کے حصّہ دار رہے ہیں۔ اِسی طرح انجمن کشمیری مسلمانِ لاہور کے بھی سیکرٹری کے فرائض بھی اُنہوں نے انجام دیے ہیں۔ اقبال جیسے مایہ ناز سپوت کی عالمِ انسانیت بشمول اہالیانِ کشمیر کے تئیں خدمات کے پیش نظر یہاں کے علمی اور ادبی حلقے اُنہیں وقتاً فوقتاً مختلف پیرایوں میں خراج پیش کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ جذب و شوق کے ساتھ برابر جاری ہے۔ کشمیر میں اقبال پر ہوئے کام کو مختلف عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر اقبال پر تصانیف و تالیفات کی اشاعت، اقبال پر منظومات اور متفرق اشعار جو اُن کے خراج تحسین پر مشتمل ہیں، جامعۂ کشمیر کے شعبۂ اُردو اور اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے زیر اہتمام تحریر کرائے گئے ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالات، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام سے رسالہ شیرازہ (اُردو و کشمیری) کے اقبال نمبر، پرتو

---

[1] ان ترجمہ کاروں کے اسمائے گرامی یوں ہیں۔ جسٹس شیخ عبدالرحمٰن، مولوی سید عبدالرشید فاضل، سمندر خاں سمندر، محمد بخش واصف، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، بہروم رنگ کوٹی۔

اقبال، زِ ژِ ہلم (علامہ کے کلام کا انتخاب اور اُس کا کشمیری ترجمہ ترتیب امین کامل)، اقبال نمائش، اقبال کے زیر اثر کہی گئی نظمیں غزلیں اور متفرق کلام، اور کلامِ اقبال کے منظوم کشمیری تراجم، وغیرہ وغیرہ۔

کلام اقبال کے تراجم جہاں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں، وہاں اِس کام میں شعرائے کشمیر نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لے کر اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ بعض شعراء نے اُن کے مبسوط مجموعوں کے منظوم ترجمے کئے ہیں اور بعض نے جستہ جستہ اُن کی غزلیات، منظومات اور کلام کے مختلف حصّوں کو کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے۔

خطۂ کشمیر کے موضع سوپٹ ٹنگہ پورہ، تحصیل کولگام ضلع اسلام آباد (موجودہ ضلع کولگام) کے مشہور شاعر غلام احمد نازؔ کولگامی وہ پہلے کشمیری ہیں جنہوں نے اقبال کی پہلی فارسی تصنیف مثنوی ''اسرار خودی'' کا (جس کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی ہے) منظوم ترجمہ ایرانِ صغیر کی زبان کشمیری میں کیا۔ یہ ترجمہ اقبال پر سب سے زیادہ وقیع کام کرنے والے نمائندہ ادارے اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں شایع کیا گیا۔ بعض لوگوں[1] کو یہ تسامح ہوا ہے کہ غلام قادر اندرابی (کشمیری) کا منظوم ترجمہ ''بالِ جبرئیل'' کلام اقبال کا پہلا منظوم ترجمہ ہے، لیکن جب ہم غلام قادر اندرابی[2] اور غلام احمد نازؔ کے ترجمہ بال جبرئیل اور اسرار خودی کے سنِ اشاعت کا موازنہ کرتے ہیں تو اولیت کا سہرا غلام احمد نازؔ ہی کے سر باندھنا پڑتا ہے۔

بہر حال بات ہو رہی ہے غلام احمد نازؔ کولگامی کے منظوم ترجمۂ اسرار خودی کی۔ اِس کتاب کا پیش لفظ اُردو کے نامور ادیب اور اقبال شناس ممتاز حسن نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کے تعارف کے مطالعے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ نازؔ کولگامی کو یہ ترجمہ کرنے کی تحریک کشمیری زبان ہی کے ایک ادیب غلام رسول طاؤس بانہالی سے ملی ہے۔ موصوف اِس ضمن میں رقم طراز ہیں:-

''پُرس یمنی دوہن اُسی نازصاب مے سمگھنہِ کراچی پیٹھ راول پینڈی آمتی سیٹھا بخشہ پتہ کورے نازصابس اسرار خودی

---

[1] کاشر بال جبرئیل ترجمہ کار سیّد غلام قادر اندرابی۔ پیغام۔ شیخ محمد عبداللہ۔

[2] ۔غلام قادر اندرابی کے منظوم ترجمۂ بال جبریل کی اشاعت اول ۱۹۸۲ء میں ہوئی ہے۔ (اشاعتِ ثانی ۱۹۸۶ء میں ہوئی ہے)

ہندہ ترجمک سُہ انگریزی نسخہ حوالہ یُس ڈاکٹر نکلسن (Dr. Nicholson) کورمت چھ۔ میون مدااوس نازصاٗ بس کُنہ پاٗٹھی سُہ مشرودمُت سبق یاد پاوٗن یمہ بابت علامہ اقبالہ سند تھدِ پایکے کانہ دوستاد آسُن گوٗھ ہے۔ شکر چھُ کہ میون مُداسپن پُور تہ نازصاٗ بنہ شاعری تہ لُہی تقریبن ارداہِ (۱۸) وریہ پتہ دوبار زندگانی''۔

اقبال نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اُردو سے کیا تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، وسیع اور عمیق مطالعے کے نتیجے میں اُن کے فکر و نظر میں بتدریج ارتقاٗ ہوتا رہا۔ اپنے دقیق افکار کو اظہار کی شکل دینے اور اُنہیں وسیع حلقوں تک پہنچانے کے لئے اُنہیں اُردو کے مقابلے میں فارسی زبان زیادہ موزون محسوس ہوئی، چنانچہ وہ اسی زبان کو زیادہ تر اپنے افکار کا ذریعہ بناتے رہے۔ جہاں تک غلام احمد نازکولگامی کے منظوم کشمیری ترجمۂ اسرار خودی کا تعلق ہے، غلام رسول طاوٗس بانہالی نے کشمیری زبان کو چھوٹی زبان یا کم سن (لوٗکٹ) قرار دیا ہے۔

فارسی زبان کی حلاوت، شیرینی اور گہرائی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس زبان میں علامہ کے دقیق افکار کو منتقل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نازصاحب فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں کے مابین نمایاں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوّل الزکر کو گلستان اور ثانی الزکر کو کلی (پوشہِ ٹور) سے تعبیر کرتے ہیں۔

گلستان پارسی کے پھولوں کی بوقلمونی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ کشمیری زبان کی فارسی کے مقابلے میں تنگ دامانی کا بخوبی شعور و احساس رکھتے ہیں، تاہم ترجمے میں اقبال کے خیالات اور خودی کے موضوع کی روح کو منتقل کرنے میں اُنہوں نے خاصی احتیاط برتنے کا اعتراف کیا ہے۔ کہیں کہیں اقبال کے کسی شعر میں درآئے معنی کو منتقل کرنے کی غرض سے ایک سے زائد اشعار مخصوص کر دئے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر مصرعے کے عوض مصرعہ اور شعر کے عوض شعر برتنے کا التزام کیا ہے۔ ترجمہ کے دوران شہر اور دیہات دونوں میں بولی جانے والی کشمیری زبان کے الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ ترجمے کے ابتدائی صفحات میں مترجم نے ''پنٔنی کتھ'' یعنی اپنی بات عنوان کے تحت کئی خیالات کا اظہار کیا ہے، جن میں بعض

۱۔ ترجمہ:۔ گزشتہ برس انہیں ایام کے دوران نازصاحب کراچی سے راولپنڈی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کافی بحث کے بعد میں نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمے کا وہ نسخہ نازصاحب کے سپرد کیا جو ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے۔ میرا مقصد نازصاحب کو کسی بھی طور وہ فراموش شدہ سبق یاد دلانا تھا جس کے لئے علامہ اقبال ہی کے جیسا کوئی بلند مرتبت اُستاد ہو۔ شکر ہے کہ میرا مقصد پورا ہوا اور نازصاحب کی شاعری نے بھی تقریباً اٹھارہ برس کے بعد حیاتِ نو حاصل کی۔ کاشر اسرار خودی ..... غلام احمد نازکولگامی۔ طبع دوم ۱۹۸۳ء۔ زان۔ ص۔ ط

بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور نازؔ صاحب کے نظریۂ شعر کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی بات کا اختتام چند اشعار پر کیا ہے جن میں شاعر اُسی کو قرار دیا گیا ہے جس کی ذات ظلمات میں نور بکھیرنے کا کام انجام دے۔ یعنی اُن کا نظریۂ شعر اخلاقی اور مقصدی ہے۔ اُن کے نزدیک شعر تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ چنانچہ دُنیا کی کسی قوم پر جب غفلت طاری ہوتی ہے تو شاعر اپنی آواز بلند کر کے اُسے خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ یہ آواز مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے، کبھی رومیؔ، تو کبھی عطارؔ، کبھی اقبالؔ تو کبھی سُورداس اور کبھی کالیداس۔ ترجمہ کار نے خودی کی پیشکش کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ کی اس کاوش اور فلسفۂ خودی کی اہمیت پر انہیں لایق استحسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

خودی ہند اسرار کرُی موزون تُمی سانہِ باپتھ ہور جگرک خون تُمی

(یعنی اُنہوں نے (اقبالؔ نے) خودی کے اسرار موزون کر کے ہماری خاطر اپنا خون جگر بہایا۔)

جب فرد اپنی خودی کو عمل صالح کی بدولت مستحکم کر کے مرتبۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے تو اُسے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے، نازؔ کولگامی کو اقبال کی اس مثنوی میں حیاتِ سرمدی کا نشان نظر آیا، غالباً یہ وہ بنیادی سبب ہے جس کے تحت انہوں نے اس مثنوی کے ترجمے کا بیڑا اُٹھایا۔

ترجمہ کاری کا عمل نہایت سنجیدہ عمل ہے۔ اِس میں کسی تخلیق کو از سرِ نو پانا ہوتا ہے، چنانچہ اِسے Recreation (یعنی دوبارہ تخلیق یا تخلیق نو کے لفظ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ترجمہ کاری کے ہر فن کی طرح اپنے لوازمات ہیں، جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس زبان سے کسی تخلیق کا ترجمہ کر رہا ہو اور جس زبان میں کر رہا ہو، اُن دونوں زبانوں کے لِسانیاتی عمل سے واقفیت رکھتا ہو۔ نیز اُس کا کام بشریاتی یعنی Anthropological بھی ہے۔ ترجمہ کار کی دونوں زبانوں کی تہذیب، ان کے مزاج، ان کے لب ولہجہ یا آہنگ سے آگاہی لازمی ہے، بالخصوص جب وہ کسی کلامِ منظوم کا منظوم ترجمہ کر رہا ہو۔ مذکورہ لوازمات کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں جو لفظی ترجمے سامنے آتے ہیں اُنہیں کو دیکھ کر کسی تصنیف یا تخلیق کے مقابلے میں ترجمے کے کام کو کم تر سمجھا جاتا ہے، ورنہ ترجمے کا کام اپنے لوازمات کی تکمیل کے پیش نظر کسی بھی طرح تخلیقی کام سے کمتر نہیں۔

نازؔ کولگامی "اسرار خودی" کا ترجمہ کرنے سے پہلے اقبال کی دو ۱۲ اہم نظموں شکوہ اور جوابِ شکوہ کا ترجمہ کر

چکے ہیں۔ "معراج نامہ" کے نام سے اُن کی پہلی تصنیف خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کا کلام کشمیری زبان میں تین حصوں میں مدوّن ہو کر کلام ناز کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھے شاعر تھے، اِس لئے اُن کی شعری صلاحیتیں بھی اسرار خودی کے منظوم کشمیری ترجمے میں جا بجا کارفرما نظر آتی ہیں۔ ترجمے کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد اِس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اِس میں وہ رُوح یقیناً موجود ہے جو اصل کتاب میں موجزن ہے۔ ایسا ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ ترجمہ کار کسی مصنف کا بوجھ اُٹھا رہا ہے اور اُس کے افکار کو گراں محسوس کرتے ہوئے اُس کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں، بلکہ اُنہوں نے ایک معاملہ فہم اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے اصل تصنیف سے شہد کی مکھی کی طرح پھولوں کا جوہر نکال کر نہایت عرق ریزی سے قارئین کے سامنے ایک خاصے کی چیز رکھ دی ہے۔ بعض مقامات پر ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی تخلیق کا ترجمہ نہیں بلکہ اصل تخلیق کا مطالعہ کر کے اُس سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اقبال جیسے رفیع المرتبت فلسفی شاعر کے افکار کی باریکیوں اور گہرائیوں کو سمجھنا، اُن سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا اور اُن کے تئیں شایاں شان برتاؤ رکھنا اُن کے کسی بھی زبان کے ترجمہ کار کے لئے دعوتِ مبارزت سے کم نہیں۔ یہاں تو نکلسن[1] جیسا عربی اور فارسی دان عالم بھی بعض اوقات غچا کھا جاتا ہے۔ ناز کولگامی کے ترجمہ کو پڑھ کر ایسا نہیں لگتا کہ وہ اصل تخلیق سے باہر نکل کر پھیل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اُنہوں

---

[1] نکلسن نے اسرار خودی کے ایک عنوان "در بیان اینکہ خودی از سوال ضعیف میگردد" کے تحت آنے والے ایک شعر۔

تا بکے در یوزۂ منصب کنی صورتِ طفلان زنے مرکب کنی

کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

How long wilt thou sue for office

And ride like children on a woman's back

مترجم نے زنے کو زنے یعنی woman سمجھ کر نے۔ کا ترجمہ Reed کی بجائے زنے (زن) یعنی woman کر دیا۔

یا۔ از رموزِ زندگی آگاہ شو ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

کا ترجمہ نکلسن یوں کرتے ہیں۔

Gain knowledge of life's mysteries!

Be a tyrant! ignore all except God!

پروفیسر غلام رسول ملک ایسے ترجمے کو ترجمہ نہ سمجھتے ہوئے اسے اصل کی "travesty" سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ نکلسن نے بڑی آسانی سے ظالم و جاہل کے فقرہ میں واؤ عطف کو گرا دیا ہے اور شعر کے مصرعۂ ثانی کو ناتمام کر کے ایک ایسے مفہوم سے گرانبار کر دیا جو زبان یا تخیل کی کسی بھی کھینچ تان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ The western Horizon-(2009) P-169

نے خود کو اصل تخلیق کے قریب رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ تخلیق اوّل کے احساس یا موجودگی سے بے نیاز ہوتے نہیں دکھائی دیتے۔ ایسا کرتے ہوئے پاسِ ادب اور اقبال کی شعری عظمت دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک مخصوص لہجہ ہوتا ہے، کشمیری زبان بھی اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتی ہے، کسی تخلیق کے ترجمے میں زندگی اور توانائی کی شناخت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کیا ترجمہ کار ایک مخصوص لہجہ کو برقرار رکھ پایا ہے یا نہیں؟ نازؔ کولگامی کے ترجمے کو شروع سے آخر تک پڑھیے، ہر جگہ ایک خاص لہجے کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اب ہم ''اسرار خودی'' اور اس کے منظوم کشمیری ترجمے (جو اس وقت زیر بحث ہے) سے چند مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کریں گے تا کہ اِس بات کا تعین ہو سکے کہ اقبال کے افکار کو کشمیری زبان میں ڈھالنے میں کشمیر سے دُور رہ کر ہمارا یہ کشمیری الاصل شاعر اور افکارِ اقبال کا شیدائی کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور کس حد تک اصل سے وفاداری کا حق ادا کیا ہے۔ یہی وہ مقام یا مرحلہ ہے جہاں تخلیق اوّل اور ترجمے کا موازنہ کرنے کی احتیاج ہے۔

پیکر ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
عالمِ ہستی خودی ہُند اکھ نشان سیر تمہ گے چھے یہ کینوھا چھک وچھان
خویش را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد
پان پنہ نُے خودیہِ یلہِ بیدار کور تمُ خیالک عالماہ اظہار کور
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او غیرِ اُو پیداست از اثباتِ اُو
تس کھٹت ذاتس اندر دنیا چھِ کاتی غیرِ حق نون دراو اثباتہِ ستی

در جہاں تخم خصومت کاشت است خویش را غیرِ خود پنداشت است
پان پنہٗ نُے غیر زُونن پانہ تمُ دُنیس دود دشمنی ہُند دانہ تمُ
سازد از خود پیکرِ اغیار را تا فزاید لذتِ پیکار را
غار پنہ نی اَندر تمُ پاَدا کورن تی کرِت لذت سیٹھاہ واَرس دِتُن
بہر یک گُل خونِ صد گلشن کند از پئے یک نغمہ صد شیون کند

یود اُنن آسیس اکس پوشس بہار چھے کران تھ پت سیٹھاہ گلشن نثار
شعلہ خود درشرر تقسیم کرد جُز پرستی عقل را تعلیم کرد
باگرن تبنگل پنُن تبزبن اندر عقل ہیچھ ناون جُوس پُوزا ژہ کر
گر بہ فطرت پختہ تر بُودے نگیں از جراحتِ ہا بیا سودے نگیں
کرانکس ہر گاہ پختہ فطرت آسہِ ہے زخمہ نِش بَچُنج تِمس وَتھ آسہ ہے
می شود سرمایہ دارِ نامِ غیر دوشِ اُو مجروح بارِ نام غیر
غارسُندِ ناوُک پھسکبن پیٹھ چھوک چھُ تس بارِ تُلمت چھُن یہوی سرمایہِ بس
چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
یامَ کُر محکم زمینن پانہِ ذات زُون چھس پھیران اندُ اندُ دوہ تہ رات
ہستیٔ مہراز زمیں محکم تراست پس زمیں مسحور چشمِ خاور است
دَر زمینکہِ کھوتہ اختانچ خودی چھے توے موحتاج سوے اختا بچی
جنبش از مژگاں برد شانِ چنار مایہ دار از سطوتِ اُو کوہسار
بونہ ہندِ تھزرُک تہ بجرُک وچھتہ شان چھنہ اُ چھن فرصت سو ٹٹہِ وہرچ دِوان
تاروپودِ کسوتِ اُو آتش است اصلِ اُویک دانہ گردن کش است
نارِ پنہِ وونت پلو لاگتِ چھِ تس چھُس اثر بیالِکُ توے تھزُ کار چھس
چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست می کشاید قلمزے از جُوے زیست
بیلہِ انان سو مبرت پنُن طاقت خودی سودر سپدان آسہِ یود کول خودی

گہرائی فکر کی حامل اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کو کشمیری نظم میں ڈھالنا بجائے خود بڑی بات ہے۔ یہاں ترجمہ کار کی تخلیقی استعداد کے ساتھ ساتھ اُن کی انتقالِ معانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے مختلف مصرعوں اور اشعار میں در آئی علامات، اشارات اور آیات کے حوالوں کی حواشی میں نشاندہی کر کے انہیں قارئین کے لئے قابلِ فہم بنایا ہے جس سے ترجمہ کار کی عربی دانی کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے اُنہیں کئی مقامات پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تاہم وہ

نہایت ہی حسن وخوبی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے رہے ہیں۔ اِس ترجمے کی نسبت جب میں نے کشمیری زبان وادب کے ایک معتبر ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر رحمان راہی سے اُن کی رائے معلوم کی تو اُنہوں نے مجھ سے اس کے اشعار مختلف مقامات سے سنانے کے لئے کہا، اشعار سن کر مندرجہ ذیل الفاظ میں اس ترجمے پر اپنی رائے رقم فرمائی:

''مرحوم نازکولگامی صاٗبن ''اسرارِ خودی'' ہند کا شر ترجمہ ڈُچھ مے یہ ڈُپی زتہِ پیٹھی پیٹھی، تہ یہ ژینتھ گوس خوش زکاٗشر زبان چھنہ رسہ کیسرِ گمژ باسان۔ اکہ زباٗنی ہند کانہہ تہ تخلیقی تحریر بس زباٗنی منز پھرن چھنہ سہل، زالن والہو چھُ یہ کارنا ممکن تہِ گنٛز رودمُت، وَں گو ترجمہ کرنس چھ پنٛژ اہمیت۔ زیرِ نظر ترجمہ چھُ یمہ کنٛز لایق توجہ باسان زِ اَمہ ڈسٕ چھُ پرن وول اصل مصنف یعنے علامہ اقبالس کم قلیلاہ نکھ واتان، کہیں نے تہ علامہ سُند فکری وڈو چھُ زانن تگان۔ یہ ممکن بناٗوِتھ چھے مرحوم نازصاٗبن کاشُر زانن والین لادِ نے تھاٗومژ''۔[1]

نازکولگامی نے ''اسرار خودی'' کے منظوم کشمیری ترجمے کے ذریعے دوہری خدمت انجام دی ہے۔ اوّل زبان کشمیری کے تئیں اپنی بے پناہ محبت اور عقیدت کے باعث اِس میں لعل وگوہر جڑ دیے ہیں، دوم اقبال کے فلسفۂ خودی سے اہلِ کشمیر کو واقفیت بہم پہنچائی، اُن کی یہ خدمت قابل تحسین ہے۔

دل تبنہ لاوورازہونزن موختہ بُرونا

یتھ کاٗشرکس آستانس چُونہِ جرونا

کشمیر میں اقبال شناسی کے سلسلے میں، بالخصوص کلامِ اقبال کو کشمیری زبان میں منتقل کرنے کے حوالے سے، جو مسائل درپیش ہیں، وہ کم وبیش وہی ہیں جو دوسری زبانوں میں اقبال کے کلام کو ڈھالتے ہوئے مترجمین

۱۔ (پروفیسر) رحمان راہی۔ ۱۵۔ اپریل ۲۰۱۱ء

ترجمہ۔ میں نے مرحوم نازکولگامی کے ترجمۂ اسرار خودی پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ یہ محسوس کر کے مجھے مسرت ہوئی کہ کشمیری زبان کسی بھی طور خفت کے احساس سے دوچار نہیں ہوئی ہے۔ کسی زبان کے فن پارے کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ ماہرین نے اِس عمل کو ناممکن امور میں گردانا ہے۔ تاہم ترجمے کی اپنی اہمیت ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ اس اعتبار سے لایق اعتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قاری مصنف یعنی علامہ اقبال کے مافی الضمیر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ کم از کم علامہ کی فکری پرواز سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اِس خدمت کے پیش نظر اہل کشمیر مرحوم نازکولگامی کے مرہون منت ہیں۔

کو پیش آتے رہے ہیں، اِن مسائل کو حل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ اقبال کے افکار کی بلندی اور گہرائی سے قرار واقعی شناسائی حاصل کی جا سکے۔ فکرِ اقبال کو کسی دوسری زبان میں ڈھالنے کے لئے اقبال کے پورے فکری نظام، جس میں قرآن و حدیث کے علاوہ اسلامی اور مغربی فکر و فلسفے کے علاوہ مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی، اُردو اور ان کے ادب سے گہری واقفیت لازمی ہے۔ میرے خیال میں کلامِ اقبال کے بعض حصّوں کا جستہ جستہ ترجمہ کرنے کے بعد اقبال کے پورے فکری سرمائے کو کشمیری زبان میں ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ عالمی سطح پر موجودہ پُر تناؤ صورت حال اور بالخصوص کشمیر اور اہل کشمیر کی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ اقبال نے سالہا سال پیشتر اپنے کلام منظوم اور نثری تحریروں میں جس محکوم و مجبور و فقیر کشمیر کی تصویر کشی کی تھی، آج کشمیر اُس سے کہیں زیادہ محکوم و مجبور و فقیر ہے۔ اہلِ نظر اقبال کو بدلتے زمانے کے نت نئے تقاضوں کے آئینے میں دیکھنے پر خاصا زور دے رہے ہیں، بلکہ پاکستان کے دانشور، شاعر، ادیب، مترجم اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی بہت پہلے اقبال کے افکار کی وسعت، تنوع اور گہرائی کے پیش نظر اس کے لئے کسی عظیم بوطیقا کے ابھی ظہور میں آنے کی ضرورت پر زور دیا تھا کیونکہ انہیں کے الفاظ میں ''بڑے آدمیوں کی طرح بڑی کتابیں بھی Charisma کے اسرار کے تحت ظہور میں آتی ہیں''۔ ہمارے سامنے انگریز مستشرقین کی کئی مثالیں ہیں جنہوں نے بے پناہ مشقتیں اُٹھا کر کے ابوالمغیث الحسین بن منصور حلاّج، مولانا جلال الدین رومی، اور علاّمہ اقبال پر قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ اقبال اور اقبالیات کے بہ فضلِ الٰہی خاصے روشن امکانات ہیں، بشرطیکہ مصلحتوں، سہل انگاریوں اور گھسی پٹی راہوں پر چلنے کی خو ترک کر کے ہر منزل کو مرحلہ سمجھ کر مسلسل نئی منزلوں کا سُراغ پانے کا سلسلہ جاری رہے، تاکہ خوب سے خوب تر کی تلاش کی جا سکے بقول علاّمہ اقبال ؎

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

پروفیسر غلام رسول ملک بحیثیت اقبال شناس

ایک مختصر تعارف

ڈاکٹر بدرالدین بٹ

اقبال کو کشمیر اور اہل کشمیر کے ساتھ والہانہ اور جذباتی تعلق خاطر تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے بقول وہ اپنے کالبُد خاکی کو کشمیر کی گلزار آفرین خاک کا پتلا سمجھتے تھے۔ وہ اگرچہ جاہلانہ اور متعصبانہ وطن پرستی کے خلاف آواز بلند کرتے تھے لیکن اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ اپنے آپ کو کشمیر ہی کے کنعان کا گم گشتہ یوسف سمجھتے تھے۔[1]

کشمیر کے ساتھ اقبال کے جذباتی انسلاک کے بارے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی یوں رقم طراز ہیں

''کشمیر جنت نظیر سے اقبال کے وجود معنوی کو کچھ ایسا ربط ہے کہ اگر ہم اقبال کی شخصیت اور شاعری کو علامتی صورت میں دیکھنا چاہیں تو تخیل میں وادیٔ کشمیر کے جلیل و جمیل نقوش ابھرتے ہیں۔ اس کے برف پوش پُر جلال کُہسار، اقبال کے فکرِ روشن کی تابناک رفعتوں کے عکاس ہیں اور اسکی گُل بدامن و پُر بہار وادیاں کلام اقبال کی شعری و فنی رنگینیوں کی آئینہ دار۔ اقبال کی مفکرانہ شخصیت ہمیں اُن مہاتماؤں کی یاد دلاتی ہے جو ہمالیہ کے دامن میں دھونی رچائے، آسن جمائے جپ تپ گیاں دھیان میں محو رہتے ہیں''۔[2]

اہلِ کشمیر کے لئے اقبال کی محبت، ہمدردی، غم گساری اور آزادی کشمیر کے لئے ان کی بے قراری دیدنی ہوتی تھی۔ ''وہ کشمیر کے سچے عاشق، اہل کشمیر کے سچے دوست اور ہمدرد اور اُن کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار، ان کی غریبی اور غلامی کے ماتم گُسار اور مطلق العنانیت کے خلاف کشمیریوں کی جدوجہد میں شریک کار تھے وہ کشمیر کے اُن محسنوں میں شامل تھے جن کے قلم کا احسان کشمیریوں پر ہمیشہ رہیگا''[3]۔ تحریک حریت کشمیر پر اقبال کے احسانات کا برملا اعتراف مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات آتش چنار میں یوں کیا ہے۔

''انہوں نے اسوقت کشمیر اور کشمیریوں کی سربلندی کے خواب دیکھے جب ہم میں سے اکثر ماں کی کوکھ میں لوریاں سن رہے تھے جب کشمیر پر ظلمت اور ظلم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں تو وہ فرما رہے تھے ؎

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

یہ اُس مردِ مومن کی دعاؤں کا اعجاز تھا کہ ۱۹۳۱ء میں یہ بے دست و پا قوم مطلق العنانیت اور استبداد کی آہنی سُلاخوں سے اپنا سر ٹکرانے پر آمادہ ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آزادی کی شمع شہیدوں کے لہو سے کچھ اس طرح روشن ہونے لگی کہ صدیوں کا اندھیرا چھٹ گیا''۔ ۴

کشمیر میں آج تک اقبال کی جو پذیرائی ہوتی رہی اسمیں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اقبال کے لئے کشمیریوں کی محبت عقیدت کی حد تک بڑھی ہوئی ہے اور کشمیر کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں پر اُن کے نام پر کوئی کالج، کوئی اسکول، کوئی بازار، کوئی بستی کوئی پارک حتیٰ کہ کرکٹ میچ یا ٹورنامینٹ قائم نہ کیا گیا ہو۔ یہ اعزاز و اکرام سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر جاری و ساری ہے، کشمیر کی سیاسی جماعتیں چاہے وہ قومی دھارے کی ہوں یا تحریک مزاحمت سے وابستہ ہوں، اپنے اپنے انداز میں اقبال کی تعظیم و توقیر کرتے ہیں، کشمیر کے دانشور، علمائے دین ادباء شعرا، صوفیاء مُبلغین اسلام اور عاشقانِ رسولؐ اقبال سے کسب فیض کرتے رہتے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بقول اہل کشمیر کے دلوں میں اقبال کے لئے جو عقیدت و محبت کا جذبہ موجود ہے اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ کشمیر کے رسائل، اخبارات اور علمی، ادبی اور سماجی محفلوں پر ایک نظر ڈالنے سے بآسانی یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ذکر اقبال اہل کشمیر کے لئے ایک موضوع نہیں بلکہ ایک تہذیبی انداز فکر اور ایک طرح کا رُجحان طبع ہے، جسطرح اقبال کے لئے ذکر کشمیر ذکر محبوب کی حیثیت رکھتا ہے اُسی طرح اہل کشمیر کے لئے بھی ذکر اقبال ایک ذکر محبوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۵

کشمیر یونیورسٹی نے اقبال کی علمی، ادبی، فلسفیانہ اور شاعرانہ عظمت کو زیر نظر رکھنے کے علاوہ کشمیری عوام کے جذبات اور اقبال کے ساتھ اُن کی بے پناہ عقیدت کا لحاظ کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے زیر ہدایت مرکزی لائبریری کو اقبال کے نام کے ساتھ معنون کیا۔ اس کے علاوہ اسی یونیورسٹی میں ۱۹۷۷ء میں دنیا کی پہلی مَسند اقبال (Iqbal Chair) قائم کی گئی۔ یہ وہ اعزاز

ہے جو کشمیر نے پاکستان سے بھی پہلے حاصل کیا کیونکہ یہاں اقبال چیئر قائم ہونے کے بعد ہی پاکستان میں اقبال چیئر قائم ہوئی تھی۔ مارچ ۱۹۷۹ء میں اقبال چیئر کا درجہ بڑھا کر اقبال انسٹی ٹیوٹ بنا دیا گیا اور اس کے پہلے ڈائریکٹر مرحوم پروفیسر آل احمد سرور مقرر کئے گئے۔ جب سے اب تک یہ ادارہ برابر شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ سیمیناروں اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اس ادارے سے آجتک ستر سے زاید ایم۔فل۔ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کی گئی ہیں اور تقریباً اسی تعداد میں اردو اور انگریزی مطبوعات قارئین کے سامنے آچکی ہیں۔ اسوقت اس ادارے کا شمار برِصغیر کے اہم ترین تحقیقی اداروں میں ہوتا ہے۔ ادارے کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب ماہر اقبالیات ہونے کے علاوہ عاشق اقبال بھی ہیں جو ہر گھڑی انسٹی ٹیوٹ کی فلاح اور ترقی مزید کے لئے مُستعد رہتے ہیں۔ ۶

اقبالیات کے حوالے سے معاصر کشمیر میں جن اساتذہ نے برصغیر ہندو پاک میں خاصا نام کمالیا ہے ان میں پروفیسر غلام رسول ملک صاحب کی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن کا شمار مقتدر ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے بقول ''اگر ہم اردو شاعری، بطور خاص اقبال کی شاعری پر لکھنے والے اقبالیین کا جائزہ لیں تو فکر اقبال کے تمام پہلوؤں اور اقبال کی نثر و نظم کے پورے ذخیرے کو سامنے رکھ کر اس پر کلام کرنے اور ایک صحیح تنقیدی وژن اور توازن کے ساتھ اس کا نقد و تجزیہ کرنے والے ایسے مُصنفین بھی بہت کم اور خال خال نظر آئینگے، جنہیں ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، پروفیسر غلام رسول ملک کا شمار بھی ایسے ہی گِنے چُنے اقبالیین میں ہونا چاہیئے''۔ ۷

عالمی سطح پر اقبالیات میں اُن کے پایۂ اعتبار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال اکادمی پاکستان نے ۲۰۰۲ء میں ''اقبالیات کے سو سال'' (طبع دوم ۲۰۰۷ء) کے نام سے جو ضخیم کتاب بڑے پیمانے پر شائع کی ہے اسمیں جموں و کشمیر سے صرف پروفیسر ملک صاحب کا مقالہ ''اقبال کا قرآنی اندازِ فکر و نظر'' شامل کیا گیا ہے۔

انگریزی کے نامور اُستاد اور قلمکار ہونے کے علاوہ آپ کو اردو فارسی اور کشمیری زبانوں سے کما حقہ واقفیت حاصل ہے۔ آپ کے علمی مقالات اور تبصرے ملک اور بیرون مُلک کے مجلات جیسے چارلیس لیمب بُلیٹن (انگلینڈ) مُسلم وَرلڈ بُک رِیو (انگلینڈ) اقبال ریویو (لاہور، پاکستان) اقبال کوارٹرلی (اوہیو

امریکہ) انڈین ہسٹاریکل ریویو (Indian Historical Review) (نئی دہلی) وغیرہ میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔

اقبالیات سے گہرے شغف اور غیر معمولی دلچسپی کے نتیجے میں ملک صاحب اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے روز اول سے ہی اسکی علمی وادبی سرگرمیوں میں پورے جوش وجذبے سے شامل رہے ہیں اور اپنے گرانقدر مقالات سے سامعین کے دل موہ لئے ہیں۔ انگریزی زبان وادب اور کشمیری ثقافت پر ان کی کئی تصنیفات کے علاوہ ملک صاحب آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کیمرج یونیورسٹی پریس، اورینٹ اینڈ لانگ مین اور شعبۂ انگریزی کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی زبان وادب سے متعلق شائع شدہ چھ مجموعوں کے کوایڈیٹر (Co- Editor) بھی رہے ہیں۔

پروفیسر ملک کی خدمات کشمیر میں اقبال اکادمی کے حوالے سے بھی قابل ذکر ہیں۔ اقبال اکادمی جموں وکشمیر کا قیام نومبر ۱۹۸۶ء میں اس غرض سے عمل میں لایا گیا تاکہ ''اشاعت کتب، سمیناروں، مباحثوں اور مجالس مذاکرہ وغیرہ کے ذریعہ تعلیمات اقبال کو اُن کے صحیح تناظر میں عام کیا جائے، اور کلام اقبال کی تشریح وتعبیر باہر سے درآمد شدہ نظریات کی روشنی میں نہیں بلکہ خُدا، انسان اور کائنات کے بارے میں اقبال کے اپنے واضح اور غیر مبہم بیانات کی روشنی میں اس نظریۂ زندگی اور نظام فکر کے مُطابق کی جائے جو ان کی تمام نگارشات پر حاوی ہے''۔[۷]

پروفیسر شوریدہ کشمیری اور مرزا عارف بیگ صاحب کے بعد ملک صاحب اس اکادمی کے صدر نشین ہوئے اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب روزِ اول سے ہی اس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ پروفیسر ملک صاحب اور پروفیسر نحوی صاحب اکادمی کے روح ورواں تھے اور انہوں نے مشترکہ طور اکادمی کے لئے چشمۂ آفتاب (۱۹۹۴ء) بیادِ شوریدہ کشمیری (۱۹۹۲ء) بیاد، خواجہ محمد امین بچھ (۱۹۹۴ء) اور حکیم مشرق (۱۹۸۹ء) مرتب کر کے شائع کیں۔

خالص اقبالیات کے حوالے سے پروفیسر ملک صاحب کی اسوقت تک تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے ایک کتاب Iqbal and the English Romantics ہے جو اصل میں اُن کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جسکی مزید نوک پلک درست کر کے انہوں نے اٹلانٹک پبلیشرز نئی دہلی سے

۱۹۸۸ء میں شائع کروایا ہے۔ ایک سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مُصنِف نے انیسویں صدی کے مشہور رومانی انگریزی شعرا، بلیک، ورڈز ورتھ، کولرج شیلے، بائرن اور اقبال کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ مقدمہ کے علاوہ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

اپنے مبسوط مقدمے میں ملک صاحب نے لکھا ہے کہ رومانی تحریک صرف انہی شعراء تک محدود نہیں تھی اور اقبال ان شعراء کے علاوہ اور لوگوں سے بھی متاثر تھے۔ چنانچہ اقبال نے شیکسپیئر پر بھی ایک نظم موزوں کی ہے اور کوپر، ٹینی سن، ایمرسن اور لانگ فیلو کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں ان شعراء کا انفرادی طور پر اقبال سے موازنہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض مخصوص موضوعات مثلاً انسان اور سماج، تصور انقلاب، کائنات فطرت اور انسان، شاعر بحیثیت انقلابی، مذہب اور جمالیات اور اقبال کو مُنتخب کیا گیا ہے تا کہ اقبال اور رومانی شعراء کے درمیان تعلق کو موضوع بحث بنا کر ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے ۸

پروفیسر ملک صاحب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اقبال بُنیادی طور پر رومانیت پسند تھے۔ عینیت کا رجحان ایام طفولیت سے ہی ان میں موجود تھا۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کی عینیت (Idealism) ان کی بے قراری و اضطراب اور خواب آسا طبیعت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں جس ذوق وجذبہ سے انہوں نے طلبہ کو رومانی شاعری پڑھائی وہ ان کے شاگردوں کے لئے یادگار زمانہ تھا۔ ان ایام میں لکھی گئی ان کی نظموں مثلاً ''ہمالہ'' ''ابر کوہسار'' ''ایک آرزو'' ''انسان اور بزم قدرت'' ''چاند'' پر رومانیت کے واضح اثرات موجود ہیں۔ اسی دوران اقبال نے ولیم کوپر، لانگ فیلو ٹینی سن اور ایمرسن کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا۔ یورپ سے مراجعت کے بعد بھی وہ کشاکش اور احساسِ تنہائی کا رونا روتے تھے۔ ان کی ''لالۂ صحرا'' (اردو) اور تنہائی (فارسی) سے اس کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ۹

اقبال کی تحریروں سے لگتا ہے کہ انہوں نے بلیک کو چھوڑ کر تمام رومانی شعراء کا غایر مطالعہ کیا تھا۔ حالانکہ بلیک اور اقبال کے درمیان کئی چیزیں مشترک ہیں۔ چنانچہ بلیک کی طرح اقبال بھی انسانی انا کی ستائش کرتے ہیں اور قوت متخیلہ کو اہم رول تفویض کرتے ہیں تاہم ان کے درمیان کچھ اہم اختلافات بھی موجود ہیں۔ ہمیں بلیک کی غزلیہ شاعری جیسے The Songs of Innocence and Experience) اور اسکی پیمبرانہ کتابوں جیسے ملٹن (Milton) اور یروشلم (Jerusalem) کے

درمیان امتیاز برتنا ہوگا جہاں بلیک شاعری میں ایک ذمہ دار فنکار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے وہیں وہ اپنی پیمبرانہ کتابوں میں ایک مُقرر کی طرح اپنے آپ کو تمام بندشوں سے آزاد کرتا ہے۔ اقبال اپنے آپ کو ایک پیشہ ور فنکار کے بندھنوں سے آزاد نہیں کرتے مزید برآں انسانی انا کی تخلیقیت پر اقبال کا یقین، اُسے بلیک کی طرح خارجی دنیا کی حقیقت سے انکار کی طرف نہیں لے جاتا۔ اقبال کی رومانیت میں عینیت (Idealism) کی آمیزش ہے۔ اسی وجہ سے وہ ورڈزورتھ سے زیادہ قریب ہیں۔ جس نے اقبال کے زیر ساخت ایام زندگی میں غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں اور جس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے دونوں شعراء نے میکانکی اور صنعتی تہذیب کی ہولناکیوں پر ایک جیسا ردعمل دکھا دیا ہے اور دونوں کی شاعری فکر و احساس اور عقل اور قوت مُتخیّلہ کی باہمی ہم آہنگی کی پیداوار ہے۔ ۱۰

پروفیسر ملک کے خیال میں انگریزی کے رومانی شُعرا میں اقبال سب سے زیادہ بائرن اور شیلے کے قریب ہیں۔ اقبال پر بائرن کے اثرات کا ثبوت ان تحسینی حوالوں سے ملتا ہے جو اقبال کی نظموں میں موجود ہیں۔ اقبال نہ صرف اس اسطور (legend) سے مسحُور تھے بلکہ فرد کی آزادی اور مختلف انقلابی تحریکوں میں اسکی عملی شرکت کی وجہ سے اُنہوں نے اسے انتہائی توقیر دی ہے۔ پیام مشرق کی ''صحبت رفتگاں در عالَم بالا'' میں اقبال بائرن کو تاریخ کی عظیم ترین شخصیات جیسے جلال الدین رُومی، ہیگل، نٹشے، برگساں مارکس، ٹالسٹائی اور آئین سٹاین کی صف میں شامل رکھتے ہیں۔ پیام مشرق میں ہی اقبال بائرن کا ذکر رومی، غالب اور براؤننگ کے ساتھ کرتے ہیں۔ ۱۱

شیلے کے ساتھ اقبال کو روحانی قربت اور اُنس ہے۔ اقبال کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر شیلے سے متاثر تھے۔ ان کی مشہور نظم ''چاند'' لگتا ہے کہ شیلے کی نظم "To The Moon" سے کسی قدر متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اگرچہ اقبال کی نظم طویل تر اور زیادہ پیچیدہ ہے پھر بھی دونوں نظموں میں کئی اہم چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں کے نزدیک چاند جُہدِ مسلسل اور دوامی حرکت اور تبدیلی کی علامت ہے۔ پھر بھی شیلے کے یہاں چاند اسکی تنہائی کی علامت ہے۔ اقبال نظم کے آخر میں بتاتے ہیں کہ انسان اپنی تقدیر کا خود مالک ہے جبکہ چاند اپنی روشنی کے لئے سورج کا دست نگر ہے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

جو میری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبین جس سے تری محروم ہے

اقبال کی بعض انقلابی نظمیں جیسے ''فرمان خدا فرشتوں کے نام'' ''خواجہ و مزدور'' اور ''ساقی نامہ'' شیلے کی نظموں To The People of England اور "Song to the Men of England" کی صدائے بازگشت ہیں۔ گو اس کا اظہار ضروری ہے کہ شیلے کے برعکس اقبال کی نظمیں شدید شعوری نظم وضبط کی تابع ہیں۔ ۱۲

پروفیسر ملک نے اپنے مقدمے میں ایک اہم انکشاف یہ کیا ہے کہ اقبال کے ابتدائی دور کی ایک نظم ''طفل شیر خوار'' کولرج کی نظم To an Infant کا ترجمہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو اقبال نظم کا ماخذ بتاتے ہیں اور نہ انکے نقادوں کے ذہن میں کبھی یہ بات آئی۔ ملک صاحب نے پہلی بار اسکی نشاندہی کی ہے۔ معمولی فرق کے علاوہ دونوں نظمیں ایک جیسی ہیں۔ ان کے مطابق اقبال نے اس نظم میں جو تبدیلیاں کی ہیں وہ ان تبدیلیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں جو انہوں نے دیگر نظموں کا ترجمہ کرتے وقت کی ہیں اور جن کا ماخذ بتا دیا گیا ہے۔ ملک صاحب کی رائے میں مغرب سے اقبال کی ممنونیت کے کئی پہلو ہنوز تشنہ طلب ہیں۔ لہٰذا اس پر مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ ۱۳

پروفیسر صاحب کی اس تصنیف کی ''علمی اور ادبی حلقوں میں جو پزیرائی ہوئی ہے وہ ان کی دِقّت نظر، اقبال کے تخلیقی سرچشموں اور اسکے افکار و تصورات کے بنیادی مآخذ سے گہری واقفیت اور سب سے بڑھکر جدید علمی اور ادبی معیاروں کے مطابق اقبال کی شاعری اور فکر کی توضیح و تعبیر کا واضح اعتراف ہے ۱۴۔ ہم یہاں پر صرف پروفیسر جی۔ کے۔ داس کے تبصرہ پر ہی اکتفا کرینگے:

"This is a work of solid, intelligent and original scholarship in an area of comparative literature and thought which is of immense significance and value to the literary scholar in India as well as in the West. In its effort to corelate the complex strands of literature and related philosophical and aesthetic thinking of the English poets of the Romantic period with several corresponding themes attitudes and techniques of the work of Iqbal it undoubtedly breaks new grounds [15]

سرودِ سحر آفرین (فکر و فنِ اقبال کے چند گوشے)

اقبال سے متعلق پروفیسر غلام رسول ملک کی دوسری اہم تصنیف "سرودِ سحر آفرین" ہے جو ۱۹۹۲ء میں پہلی بار کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ یہ کتاب اُن مضامین و مقالات پر مشتمل ہے جو مختلف مواقع پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بالکل نئے اور غیر مطبوعہ ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو مختلف سیمناروں اور کانفرنسوں بالخصوص اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام مُنعقد کیے گئے سیمناروں کے لئے لکھے گئے تھے اور بعد میں انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات میں شائع ہوئے۔ مُصنّف کتاب کے مطابق "نظر ثانی کے وقت ان مضامین میں جا بجا اضافے کیے گئے اور حواشی بڑھا دیے گئے، نتیجتاً ان میں سے اکثر مقالات اب بالکل نئے معلوم ہوں گے "اقبال اور ورڈز ورتھ" کے زیر عنوان مضمون بالخصوص اب بہت ہی مبسوط ہو گیا ہے اور اسمیں رومانیت (Romanticism) اور یورپی رومانی تحریک کے بارے میں اقبال کا زاویۂ نگاہ مُنقّح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔"

اس کتاب کو ۲۰۰۷ء میں اقبال اکادمی پاکستان نے بھی شائع کیا ہے اس اشاعت میں دو مقالات "اقبال کا قرآنی اندازِ فکر و نظر" اور "ذوق و شوق" کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اقبالیات کے بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی تقدیم کے ساتھ یہ کتاب نہایت خوبصورت کتابت و طباعت (Getup) میں شائع کی گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت اور معیار کا اندازہ ان تبصروں سے ہوتا ہے جو ہندو پاک کے مستند و معیاری مجلّات میں اسپر شائع ہوئے ہیں جنمیں اس کو "اقبالیات میں ایک نہایت وقیع اضافہ متوازن اور عالمانہ افکار کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے"۔ کتاب حسب ذیل مقالات پر مشتمل ہے:۔

اقبال کی عظمت کا راز - اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت - اقبال اور ملتِ اسلامیہ کا احیاءِ نو - اقبال کا قرآنی اندازِ فکر و نظر - اقبال اور شاہِ ھمدان، اقبال اور ورڈز ورتھ - اقبال کے پسندیدہ اصنافِ شعر - بانگ درا کی غزلیں بزم انجم کے تعلق سے - محاورہ مابین خدا و انسان، اقبال کی ایک مختصر مگر عظیم فارسی نظم - بندگی نامہ - جاوید نامہ کی تکنیک - ذوق و شوق۔

فاضل مُصنّف نے کتاب کے مبسوط مقدمے میں کئی اہم نکات زیر بحث لائے ہیں جن سے یہ بات مُترشح ہو جاتی ہے کہ وہ نہ تو آنکھ بند کر کے اقبال کی ہر بات ماننے کے قائل ہیں اور نہ ان پر مُعاندانہ اعتراضات،

الزامات اور اتہامات لگانے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کتاب کا مرکزی و محوری نقطہ یہ ہے:

''اقبال بحیثیت مجموعی ایک اسلامی مفکر اور فنکار تھے۔ بے شک اسلامی زاویۂ نگاہ سے اُن کے فکر و فن کی بعض جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور انسانوں میں اللہ کے رسولوں کے سوا ایسا کون ہے جو تنقید سے بالاتر ہو مگر مجموعی اعتبار سے وہ نیتاً اور عملاً ایک اسلامی مفکر اور اسلامی فنکار تھے۔ اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جو قرآن و سنت کی رُو سے محلِ نظر بن سکتے ہیں اسی طرح اقبال کی شاعری خصوصاً دورِ اول کے کلام سے ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی اسلام کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے بمشکل کوئی تاویل کی جا سکتی ہے مگر اپنی نیت کے لحاظ سے انہیں اسلام کے تقاضوں سے انحراف کا کبھی خیال تک نہ آیا''۔ ۱۶

پروفیسر صاحب نے ان حضرات پر بھی گرفت کی ہے جو فنکار میں وابستگی (Commitment) کو عیب قرار دیتے ہیں کیونکہ اُن کے بقول اس سے معروضیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات محتاج ثبوت ہے اور اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ ناوابستگی انسان میں ایک طرح کی وسیع النظری اور کثیر الجہتی پیدا کرتی ہے تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وابستگی سے فنکار کے اندر ایک ایسی جذباتی شدت (Emotional intensity) پیدا ہوتی ہے جس سے بقول اقبال معجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے اور سِل کے اندر دل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک جو حضرات فن کار کو زندگی اور انسانی تمدن کی طرف سے تمام ذمہ داریوں سے بَری الذمہ قرار دیتے ہیں وہ فطرت انسانی اور فطرت کائنات (جو فی الاصل ایک ہیں) سے بغاوت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بڑا فن نہ تو خواب آور ہوتا ہے اور نہ بہیمیت انگیز بلکہ اپنے مخصوص طریقے سے انقلاب آفرین اور انسانیت ساز ہوتا ہے اور اسکی انقلاب آفرینی اس کے جلالی رخ کو اور اس کی انسانیت سازی اس کے جمالی رُخ کو ظاہر کرتی ہے۔

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل ۱۷

اقبال کے بعض معاند اقبال پر تنگ نظری کا بھی اِتہام لگاتے ہیں جس کی حقیقت میں کوئی بنیاد

ہی نہیں۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اقبال کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کرلیا ہوتا ہے کہ اقبال کو یا تو سرے سے ہی غیر فنکار ثابت کرنا ہے یا کم از کم چھوٹے درجے کا فنکار۔ انہوں نے معترضین سے یہ سوال کیا ہے کہ جو شخص ''جبریل وابلیس'' اور ''نالۂ ابلیس'' میں ابلیس کے کردار کی عکاسی ھمدردی اور معروضیت کے ساتھ کرسکتا ہو، جس کے قلم سے ابوجہل کا نوحہ صادر ہوا ہو جو اس کے مشرکانہ عقاید اور نسلی برتری کے احساس کی بہترین مدافعت ہے جس نے وشوامتر، نٹشے، نپولین، بائرن، لینن اور بہت سی دوسری شخصیات کو کمال ھمدردی کے ساتھ پیش کیا ہو اسکے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ صلاحیت نفی ذات سے یکسر عاری اور یک رُخی اور تنگ نگاہی کا شکار تھا ۱۸

اقبال کے ہاں کوئی ایک واحد اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں شعری اسالیب کا ایک نِگار خانہ نظر آتا ہے ایسا غالباً اس لئے ہے کہ ہر تجرباتی نظم ایک مخصوص کردار رکھتی ہے اور اِس کے لئے ایک منفرد انداز بیان کے وضع کرنے اور تراشنے پر شاعر کو اکساتی ہے ان اسالیب بیان میں تنوّع اور ان کی گونا گونی پورے کلام کے سیاق وسباق میں فکری، جذباتی اور تجرباتی تنظیم کے دروبست کی مناسبت سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ اقبال کے ہاں ایک معروف انداز بیان کو ہم خطیبانہ یا (Rhetorical) کہہ سکتے ہیں ۱۹ سرور صاحب کے بقول اس میں بھی اقبال نے اعلیٰ شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اقبال خطابت کے سب آداب سے آشنا تھے اچھی شاعری خطابت کے آداب ضرور برتتی ہے۔ اقبال وہ طائر ہے جسکی آنکھ پرواز میں بھی نشیمن پر رہتی ہے۔ اسکی دانش وری نے اسے تب وتاب عطا کی ہے لہٰذا خطابت اقبال کی کمزوری نہیں طاقت ہے ۲۰ اس کے باوجود بعض نقاد بشمول کلیم الدین احمد اپنی ناروا تنقید سے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر ملک صاحب نے اس کا مُسکِت جواب دیتے ہوئے لکھا ہے ''خطابت کا عُنصر تمام دنیا کی شاعری کا جزوِلازم ہے۔ ایلیٹ نے جس چیز کو شاعری کی دوسری آواز کہا ہے وہ خطابت ہی تو ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ بیانیہ شاعری (Poetry of Statement) تمام عظیم شعرا کے یہاں موجود ہے اور اسے ہمیشہ مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ملک صاحب نے شیکسپیر، ورڈز ورتھ، شیلے، حافظ، سعدی، میر تقی میر، غالب، اور فیض، کے اشعار پیش کر کے اقبال کا دفاع کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے بیسیوں اشعار پیش کر کے لکھا ہے کہ اگر یہ شاعری نہیں

ہے تو پھر دنیا کی شاعری کا بیشتر حصہ دریا برد کرنا پڑے گا۔ ۲۱

''اقبال کی عظمت کا راز'' میں مصنف نے دکھایا ہے کہ اقبال بیک وقت ایک دقیقہ رس فلسفی، ایک انقلاب آفرین معاشرتی اور سیاسی مُفکر اور ایک بلند پایہ تخلیقی فنکار تھے۔ ان تمام حیثیتوں میں وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے انہوں نے مشرق و مغرب کی فکر کا غائر اور تنقیدی مطالعہ کر کے قرآن و سنت سے ماخوذ بنیادوں پر ایک نیا فلسفہ وضع کیا جو مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع اور ہمہ گیر ہے ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے نہ تو وہ مغربی فلسفے سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی روایتی مشرقی فکر کو آنکھیں بند کر کے قبول کیا بلکہ اسلام کی عملی روح کی اساس پر ایک جاندار اور متحرک نظام فکر ترتیب دیا جس کا ہیولیٰ ان کے خطبات اور بلند پایہ منظومات میں موجود ہے ۲۲

مصنف کی رائے میں جو چیز اقبال کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے اوپر اٹھا کر ثبات و دوام عطا کرتی ہے وہ ان کا دور حاضر کے آشوب کا صحیح عرفان اور اس کے مرض کی تشخیص ہے۔ ان کی نظر میں عصر حاضر کا اصل مسئلہ زندگی سے مذہب کی دوری ہے۔ مادی طرزِ فکر کے غلبہ کے نتیجے میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تعلق روحانی اقدار سے منقطع ہو چکا ہے اور اس عمل لادینیت (Secularisation) کے ہاتھوں زندگی کا ہر پہلو مسموم ہو چکا ہے۔

اقبال کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے لادین تہذیب کو اُس ماحول میں دور حاظر کے تمام امراض کا منبع قرار دیا جب اکثر لوگ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ خاک مدینہ و نجف کے سُرمہ سے منور ان کی آنکھیں نہ صرف یہ کہ اس چمک دمک سے خیرہ نہ ہوئیں بلکہ انہوں نے اسکی تہہ میں موجود تاریکی اور تباہ کاری کو بھی دیکھ لیا۔ اقبال نے مُومنانہ عزم اور داعیانہ لب و لہجے کے ساتھ تہذیب لادینی کو للکارا۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد، تو بازمانہ سَتیز
اے کہ جاں را بازمی دانی زتن
سحر ایں تہذیب لا دینی شکن ۲۳

''اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت''، میں خطبات اقبال کی روشنی میں پروفیسر ملک نے لکھا ہے کہ اقبال کے خیال میں انسان کے تمام افعال، تمدنی کمالات اور ایجادات واختراعات کا منتہائے مقصود ایک ایسے ماحول کی تخلیق ہونا چاہئے جسمیں انسان کی تمام پوشیدہ قوتوں کو ظہور پزیر ہونے کا موقع ملے۔ یہ قوتیں اُسی صورت میں ظہور میں آسکتی ہیں جب انسان کی پوری شخصیت کو پنپنے اور پروان چڑھنے کا موقعہ ملے اور اس کے جسمانی اور روحانی تقاضوں کو تسکین ملے۔ انسان نہ محض مادہ ہے اور نہ محض روح بلکہ دونوں کے ارتباط سے ترکیب پانے والی ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے جو بھی تمدن وجود میں آئے وہ ناقص اور انسانی ارتقاء کے لئے ناموزوں ثابت ہوتا ہے۔ اقبال کے خیال میں نظام اسلامی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لئے روح وجسم کی دوئی ناقابل تسلیم ہے۔ ۲۴

اقبال نے اپنے خطبے Is Religion Possible میں بڑی وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ ''مایوس انسانیت کی بیماریاں عہد وسطیٰ کا تصوف دور کرسکتا ہے نہ قومیت اور نہ خدا بیزار اشتراکیت کے نظریات۔ یقیناً یہ دور تہذیب حاضر کا بحرانی دور ہے۔ آج کی دنیا ایک حیاتیاتی تجدید کی محتاج ہے اور مذہب (جو اپنی اعلیٰ صورت میں نہ جامد وغیر معقول عقیدہ ہے اور نہ کہانت اور بے جان رسم) ہی وہ واحد قوت ہے جو اخلاقی سطح پر انسان کو اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا سکتی ہے جو عہد حاضر کی سائنسی ترقی نے اس پر ڈالدی ہے''

اقبال کے خیال میں ''آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کی روحانی فلاح اور عالمگیر نوعیت کے ایسے بنیادی اصول جو انسانی معاشرے کے ارتقاء کی روحانی بُنیاد پر رہنمائی کرسکیں''۔ ۲۵

پروفیسر ملک صاحب کی رائے میں توحید، اخوت ومساوات انسانی اور ختم نبوت کے بعد اجتہاد کی آزادی وہ اساسی اصول ہیں جو انسان کے ارتقائی سفر میں اسکی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ توحید اقبال کی نظر میں ایک انقلابی عقیدہ ہے جو انسانی حاکمیت کی جگہ خدا کی حاکمیت کو دیتا ہے۔

نبوت کے بارے میں اقبال کے خیالات بہت ہی انقلابی نوعیت کے ہیں۔ انہوں نے ایک خطبے (The Spirit of Muslim Culture) میں آنحضورؐ کے بارے میں لکھا ہے کہ پیغمبر

اسلام قدیم اور جدید عہد کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اپنی وحی کے منبع و مصدر کے لحاظ سے وہ قدیم عہد سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس پیغام کی روح کے اعتبار سے ان کا تعلق جدید عہد سے ہے۔ اسلام کا ظہور انسان کے اِستقرائی ذہن کا ظہور ہے۔ اسلام کی رُو سے پیغمبری کی تکمیل خود اپنے خاتمے کی ضرورت کے احساس پر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو ہمیشہ زنجیروں میں جکڑ انہیں رکھا جا سکتا اور یہ کہ مکمل خودشناسی کے لئے انسان کو اپنے ہی وسایل پر انحصار کرنا چاہے''[۲۶] ختم نبوت کا مطلب یہ بھی ہے کہ اب انسان تاریخ میں فوق الفطری بنیادوں پر قائم شخصی اقتدار کا دور ختم ہو چکا ہے اور انسانی فکر ہر قسم کے نا مناسب بندھنوں سے آزاد ہو چکی ہے۔

مصنف کی رائے یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد اب یہ حاملین اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے دئے ہوئے دائمی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی گوناگوں تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں اس مقصد کے لئے انہیں اجتہاد کی آزادی دی گئی ہے۔ اقبال کے خیال میں اجتہاد کی حیثیت انسان کے ارتقائی سفر میں ایک عظیم اور طاقت ور ہتھیار کی ہے۔ جو لوگ اسلام کے اصول اساسی کا صحیح فہم رکھتے ہوں وہ نت نئی تبدیلیوں اور نئی ضروریات کی تکمیل کی خاطر ان کی روشنی میں قانون سازی کر سکتے ہیں۔ تقلید جامد جو کافی طویل مدت سے ملت مسلمہ کا شعار بن گئی ہے اسلام کے حرکی نظام کی دشمن ہے۔[۲۷]

ملت اسلامیہ کے احیاء نو پر بقول ملک صاحب اقبال نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ملت اسلامیہ کے ساتھ اُن کے بے پناہ انہماک کی بناء پر بعض حلقوں کی طرف سے انہیں محض ایک فرقے کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ یہی غلط فہمی پروفیسر نکلسن کو بھی ہوئی تھی جسکو دور کرنے کے لئے اقبال نے انہیں اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ ان کے پیش نظر دراصل پوری نوع انسانی کے اندر رُوحانی بنیادوں پر ایک عظیم انقلاب پیدا کرنا ہے مگر ایسے انقلابات تاریخ میں صرف اُسی وقت رونما ہوتے ہیں جب اُن کے لئے ایک مخصوص ملت کو تیار کیا جائے اور ان کا یقین تھا کہ اپنے معتقدات' اپنی تاریخ اور اپنی معاشرت کے اعتبار سے ملت اسلامیہ میں یہ رول ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور حق یہ ہے کہ عالمگیر مساوات اور اخوت کی اگر اب بھی کہیں جھلک موجود ہے تو وہ امت مسلمہ میں ہے۔ [۲۸]

ملت اسلامیہ کے زوال اور جمود اور اسکے احیاء نو پر اقبال کے خیالات کا احاطہ کرتے ہوئے

مصنف نے لکھا ہے کہ ان کی نظر میں اس زوال وانحطاط کی دو بنیادی وجوہ ہیں ایک حیات کُش اور رہبانی نظریات کی ترویج دوسرے اجتہاد کا فقدان۔ امت مسلمہ کی حیاتِ نو کے لئے یہ لازمی امر ہے کہ تمام رہبانی نظریات سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور نئے مسایل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اجتہاد سے کام لیا جائے۔

اقبال کے نزدیک حاملین تصوف کا یہ دعویٰ کہ حضورؐ کی زندگی کا ایک باطنی پہلو بھی تھا جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہے، لغو اور بے بنیاد ہے آپؐ کی حیات طیبہ کھلی روشنی میں گذری اور آپؐ کی تعلیمات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو خفیہ ہو ۲۹

ملک صاحب نے اقبال کی تحریروں کی روشنی میں لکھا ہے کہ ملت اسلامیہ کے احیاءِ نو کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ پھر سے کھول دیا جائے موجودہ جمہوری دور میں اجماع کے اصول کے تحت مُقننہ بھی اجتہاد کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کے ممبر ایسے لوگ ہوں جو قانون اسلامی کی نزاکتوں سے واقف ہوں۔ بصورت دیگر علماء کی ایک کونسل کے ذریعہ اس کام کی نگرانی کرائی جا سکتی ہے۔ مصنف نے ان عملی اقدامات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے جو اقبال اپنے انقلابی پیغام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھاتے رہے۔ ۳۰

فکر اقبال کے حوالے سے کتاب میں شامل مقالہ ''اقبال کا قرآنی اندازِ فکر ونظر'' بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اسمیں مصنف لکھتے ہیں کہ کسی کتاب یا مصنف سے شعوری طور پر متاثر ہونا ایک بات ہے اور اسے تحت الشعور کے اندر جذب کرنا دوسری بات۔ تحت الشعور کی سطح پر کسی کتاب یا انسان کا اثر جب جزوِ شخصیت بن جاتا ہے تو یہ اثر قبول کرنے والے کے اندازِ فکر ونظر (attitude of mind) کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اسی زاویۂ نگاہ سے سوچتا ہے اور دیکھتا ہے تو اسی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس کے سانچے اور پیمانے اور حسن وقبح اور خوب ناخوب کے معیار بھی اسی منبع فیضان سے برآمد ہوتے ہیں اور اگر وہ شاعر اور ادیب ہے تو اسکا نظریۂ شعر، اسکی لفظیات اس کا اسلوب، اس کی علامتیں اور اس کے استعارے بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں قرآن کے ساتھ اقبال کا تعلق اسی نوع کا ہے۔ ۳۱

مصنف کی رائے یہ ہے کہ اقبال نے اشیاء وتصورات کے سانچے اور حُسن وقبح اور حق وناحق کے معیار بھی نہ صرف یہ کہ قرآن اور اس کی واحد مستند تفسیر سنت رسول اللہؐ سے مُستعار لئے ہیں بلکہ دوسرے اذہان میں ان پیمانوں کو اتارنے کے لئے وحی بلیغ اور حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو حضور پُرنورؐ کا

طریقۂ تعلیم تھا۔ اسی طریقہ نبوی کی پیروی کرتے ہوئے اقبال نے بہت سے تصورات کو نئے معانی و مفاہیم سے آشنا کیا۔ عقل، علم، عشق، فقر، خودی، مومن، تقدیر اور ہجرت ان میں نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۳۲

مصنف کے نزدیک اقبال کے فن پر بھی نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے قرآن کی گہری چھاپ موجود ہے۔ فن کے متعلق اُن کا نظریہ کہ یہ ایک وہبی ملکہ ہے اور اس کا اصل منبع، فیضان (Inspiration) ہے اور یہ کہ اس فطری مَلکہ کو کسب کے ذریعہ بروے کار لایا اور پروان چڑھایا جا سکتا ہے مگر اس وسیلے سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا، قرآنی ارشادات سے ماخوذ ہے۔ قرآن کا اثر اقبال کے آہنگ اور اسلوب نگارش پر بھی چھایا ہوا ہے۔ مصنف کے بقول کچھ کم نظر نقادوں نے جس لہجے کو خطیبانہ اور بیانیہ کہہ کر کم قدر کرنے کی کوشش کی ہے وہ دراصل ایک بلند آہنگی ہے جس کا قرآنی آہنگ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح اقبال کا اسلوب نگارش، ان کی علامتیں اور پیکر بھی قرآن سے متاثر ہیں یہ بات ان لفظیات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایمان، کفر، اسلام، الٰہ، بشیر، نذیر، مسجد، توحید، خلافت، شہادت، خبر، نظر، ذکر، فکر، عبد، حُر، لا اِلٰہ، لاتخف، لاتحزن، قُم باذن اللہ ایسے الفاظ ہیں جو قرآنی تلازمات کے ساتھ ان کی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں۔ ۳۳

مصنف کی رائے کے مطابق اقبال کی شبیہہ کاری اور پیکر تراشی کے تین اہم ماخذ قرآن و سنت، تاریخ اور عالم فطرت ہیں۔ قرآن و سنت سے ماخوذ جو پیکر اور علامتیں وہ استعمال کرتے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ تعمیر حرم، معمارِ حرم، دریائے خلیل اللہ، شاخ خلیل، آتش نمرود، ضرب کلیم، ید بیضا، ملت بیضاء، درخت طور، سینا، نغمۂ جبریل، صور اسرافیل، وغیرہ ۳۴

اقبال نے پیغمبروں اور تاریخ کی دوسری شخصیتوں کو تاریخی شخصیات کی حیثیت سے کم اور علامتوں کی حیثیت سے زیادہ استعمال کیا ہے یہ تاریخی علامتیت (Historical symbolism) فارسی اور اردو شاعری کو اقبال کی دین ہے خلیل و نمرود، موسیٰ و فرعون اور شبیر و یزید، خیر و شر کی قوتوں کی علامتوں کی حیثیت سے استعمال کئے ہیں اسی طرح صدیقؓ، فاروقؓ، ابوترابؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ، ابوجہل، ابولہب وغیرہ مختلف اوصاف کی نمایندہ علامتیں ہیں۔ ۳۵

تاریخی شخصیات کے ساتھ اقبال کا انہماک معنی خیز اور وسیع الاطراف علامتیت کا منبع و مصدر ہے

جوان کی شاعری کی دائمی رعنائیوں میں سے ایک ہے یہاں تاریخی شخصیات ان معانی و مطالب کی ترجمان بن جاتی ہیں جن کا اقبال کے فلسفۂ حیات سے گہرا تعلق ہے۔ مصنف کے بقول حضرت شاہ ہمدانؒ بھی انہی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ اپنے مقالۂ اقبال اور شاہ ہمدان میں (جنہیں اقبال نے سید السادات اور سالار عجم کے القاب سے یاد کیا ہے، اور جن سے اسرار مرگ و حیات، حقیقت خیر و شر اور اقوام عالم کے اسباب عروج و زوال کے متعلق استفسار کرتے ہیں)۔ اقبال کشمیر کو ایک ایسی زوال پرور قوم کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جو مقام عروج و اقبال سے گر کر مظلومی و استحصال کے قعر مذلت میں پہنچ گئی ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک یہ مثال اس لحاظ سے موزوں ترین ہے کہ دونوں شاہ ہمدان اور اقبال کشمیر کے دردمند عاشق تھے۔ ۳۶

حضرت شاہ ہمدان سے گفتگو کے دوران ہی ننگ انسانیت ''بیع نامہ امرتسر'' کا ذکر بھی آتا ہے جس کے تحت فرنگی عیاروں نے پچھتر لاکھ روپے لے کر کشمیر کو ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اقبال نے بڑے پُر درد انداز میں بادِ صبا سے التجا کی ہے کہ جینوا میں لیگ آف نیشنز کو یہ بات پہنچا دے۔

بادِ صبا ! اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند ۳۷

اقبال کشمیریوں کی غلامی اور ان کی حالت زار کا دکھڑا حضرت شاہ ہمدان کے حضور میں روتے ہیں اور اُن سے اس مسئلہ کے حل کے امکانات پر استفسار کرتے ہیں انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ کشمیریوں کے زوال و انحطاط کی اصل وجہ رُوح اور اسکے تقاضوں کی طرف اُن کی مجرمانہ غفلت اور مادی اغراض و مقاصد میں ان کا بے پناہ انہماک ہے ان کی روح بیدار ہو جائے تو وہ اپنا کھویا ہوا عروج و اقبال پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ ۳۸

مصنف کے مطابق جاوید نامہ میں جو پیغام شاہ ہمدان کی زبانی نشر ہوتا ہے وہ اقبال کا اپنا پیغام ہے۔ جو موجودہ مادی دور کی بیماریوں کے لئے نسخۂ شفا کا حکم رکھتا ہے۔ جاوید نامہ کا شاہ ہمدان، اقبال کا شاہ ھمدان زیادہ ہے اور تاریخ کا کم، مصنف نے مزید لکھا ہے کہ اقبال اور شاہ ھمدان اپنے اساسی عقاید میں

ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ دونوں قرآن وسنت سے کسب فیض کرتے ہیں اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر شاہ ہمدان آج کے دور مادیت میں پیدا ہوتے تو آج کے انسان کے لئے ان کا پیغام کم وبیش وہی ہوتا جو اقبال کا ہے۔ ۳۹

''اقبال اور ورڈز ورتھ'' میں اولاً رومانیت کے پس منظر پر مصنف نے مختصر بحث کی ہے۔ اور اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ مزاج مشرق کے ساتھ رومانی تحریک کی حیرت انگیز مماثلت نے اقبال کو اوایل عمر ہی میں اس تحریک کی طرف متوجہ کیا تھا اُن کی اپنی افتادِ طبع چونکہ رومانی واقع ہوئی تھی اس لئے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی گہری ہوتی گئی۔ انہوں نے جرمن اور انگریزی کے رومانی شعراء کا غائر مطالعہ کیا اور ان میں سے بیشتر کا اثر بھی قبول کیا! ان میں سے انگریزی شعراء ورڈز ورتھ، بایرن اور شیلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ورڈز ورتھ کے بارے میں اقبال نے خود اعتراف کیا ہے کہ

He has saved me from atheism during my student days ۴۰

ملک صاحب کا کہنا ہے کہ ورڈز ورتھ کے ساتھ اقبال کا ذہنی اور روحانی تعلق صرف اسی حد تک محدود نہیں بلکہ یہ اس عمیق اور ہمہ گیر مماثلت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان کے نظریاتِ فن اور تخلیقی کارناموں میں پائی جاتی ہے دونوں شاعری کو کسبی اور اختیاری چیز نہیں بلکہ ایک وہبی ملکہ سمجھتے ہیں دونوں کا یقین ہے کہ شعر کا تانا بانا انسانی جذبات واحساسات سے فراہم ہوتا ہے۔ اقبال قلب انسانی اور اس کی کارفرمائیوں کو شعر کی اساس سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

برگِ گُل رنگین زِ مضمون من است
مصرعِ من قطرۂ خون مَن است ۴۱

مصنف کی رائے میں مقصد شعر سے متعلق دونوں شعرا ہم خیال ہیں۔ فن کو بجائے خود مقصد قرار دینے کا فلسفہ اقبال کے نزدیک ایک مریضانہ فلسفہ ہے جو ذہنی عیاشی کے مترادف ہے۔ اقبال ان معنوں میں اپنے آپ کو شاعر گنوانا ہی پسند نہیں کرتے۔ ورڈز ورتھ نے بھی لکھا ہے کہ شاعر انسان ہے اور اُس کا روئے سخن انسانوں کی طرف ہے A poet is a man speaking to men.

اقبال اور ورڈز ورتھ کے نظریات فن میں صرف ایک امر میں اختلاف واقع ہوتا ہے اور وہ یہ

ہے کہ جہاں اقبال کے نظریۂ فن میں جلال کو بھی وہی اہمیت ہے جو جمال کو ہے وہاں ورڈز ورتھ کے یہاں اصل اہمیت جمال کی ہے۔ ۴۲

پروفیسر ملک صاحب کے خیال میں سب سے بڑھ کے جو چیز اقبال اور ورڈز ورتھ کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حیات و کائنات سے متعلق حقائق تک ان کی رسائی منطق و استدلال کے راستے سے نہیں بلکہ قلب و وجدان کے راستے سے ہوئی ہے۔ دونوں استدلال کے پائے چوبیں کو سخت بے تمکین سمجھتے ہیں اور دل کی ناقابل شکست قوت اور جذبہ عشق کی تاثیر کے قایل ہیں۔ قلب و وجدان اور تخیل کے منبع فیض سے رَبط و تعلق ہی تخلیقی فن کی دنیا میں اقبال اور ورڈز ورتھ کی عظمت کی اصل بنیاد ہے۔ ۴۳

اس مجموعہ میں اقبال کے فن پر جو سات مقالات شامل ہیں ان پر اس نشست میں کوئی تجزیہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ البتہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے تاثرات کے بغیر یہ مقالہ نامکمل رہے گا۔ ہاشمی صاحب رقم طراز ہیں۔

''موصوف مغرب کی شعری و ادبی روایات اور تنقیدی منہاج و معیار سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے اپنی تحریروں میں مقدور بھر اس سے استفادہ بھی کیا ہے مگر اُن کے ہاں نقد و انتقاد کے پیمانے تقلیدی اور کلیتاً مغربی نہیں بلکہ اجتہادی اور انتخابی ہیں جن میں اسلامی اور مشرقی فکر و ادب کی روایات اور علوم مغربی کی صالح روایات کا امتزاج ملتا ہے اس طرح اپنے طرزِ احساس و تعامل میں وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اقبال کے ایک کامیاب مقلد نظر آتے ہیں۔ قارئین محسوس کرینگے کہ ان کی تنقید میں ایک نہایت واضح صراحت (Clarity) موجود ہے جو ایک صحیح اقبالی وژن کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر ملک دینی اصولوں، اخلاقی اقدار، اردو ادب کے اِفادی پہلوؤں کے تذکرے میں کسی مصلحت یا لاگ لپٹ کے بغیر بڑے تیقن اور اعتماد کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

پروفیسر ملک کی تنقید میں جو صحت و صلابت اور توازن و تیقُّن نظر آتا ہے اس کا ایک سبب اُن کا وسیع مطالعہ ہے جو اُن جہات میں قابل لحاظ اور باعث رشک حد تک اطمینان بخش ہے جو اقبال جیسے نابغۂ عصر کے فکر کی بلندی و بُوقلونی اور اس کی شاعری کی پَروازِ تخیل، اس کے نبوغ اور اس کے ندرتِ اسلوب و فن کی تفہیم کے لئے ضروری ہے''۔ ۴۴

پروفیسر ملک صاحب کی تیسری تصنیف The Bloody Horizon (A Study of Iqbal's Response to the West) ہے۔ جو اولاً اقبال اکادمی کشمیر کے زیر اہتمام ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی ہے اس کتاب میں دس مقالات شامل تھے۔ اقبال اکادمی پاکستان نے ۲۰۰۹ء میں "The Western Horizon" کے نام سے اس کتاب کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا ہے جسمیں چار مقالات کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس کتاب میں شامل بعض مقالات درج ذیل ہیں:

1. Iqbal's Relevance to the Present Age.
2. Iqbal and Materialism.
3. Iqbal and Nationalism.
4. The Humanist Iqbal.
5. Goethe and Iqbal . The Pulsating Wisdom.
6. Wordsworth and Iqbal.
7. The Image of the West in Iqbal and Azad

اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کے لئے وقت کی تنگ دامنی مانع ہے البتہ اسکی اہمیت وافادیت اور پایہ اعتبار کا اندازہ لگانے کے لئے پروفیسر عبدالرحیم قدوائی صاحب کا یہ تبصرہ مُمد ومددگار ہوگا:۔

"The range and quality of Malik's study of Iqbal's thought is impressive and testifies to his remarkable assimilation and articulation of Iqbal's thought , a man devoted to the ideal of Islamic revivalism in our times. Malik is to be praised for enabling the reader to gain a sound understanding of Iqbal's thought, his work will be of great value for both specialized and general readers alike". [45]

حواشی وحوالہ جات

۱۔فکرِ اقبال، ایجوکیشنل بک ہاوس، علیگڈھ ۲۰۰۲ء، ص۔۴

۲۔عروجِ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۷ء ص ۳

۳۔اقبال کا فن، مرتب گوپی چند نارنگ، مقدمہ شیخ محمد عبداللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۹ء ص ۱۳

۴۔آتشِ چنار، علی محمد اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۶۹-۲۷۰، اقبال کا فن، ص ۱۶

۵۔اقبال اور کشمیر، مکتبہ علم ودانش، مزنگ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص

۶۔تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب جامعہ کشمیر اور اقبالیات، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، یونیورسٹی آف کشمیر، ۲۰۰۹ء

۷۔'تقدیم' سرودِ سحر آفرین، طبع پاکستان ص۔۱

۸۔حکیم مشرق، مرتبہ پروفیسر غلام رسول ملک و پروفیسر بشیر احمد نحوی، ص ۳۔

۹۔ Iqbal and the English Romantics, Atlantic Publishers and Distributors, New Delhi, 1988, P, 3.

۱۰۔ایضاً، صفحات ۷-۸

۱۱۔ایضاً، صفحات ۹-۱۰

۱۲۔ایضاً، ص، ۱۲

۱۳۔ایضاً، ص، ۸

۱۴۔پروفیسر محمد امین اندرابی پیش لفظ بابت سرودِ سحر آفرین، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر ۱۹۹۲ء، ص ۹۔

۱۵۔ Iqbal and The English Romantics

۱۶۔دیباچہ سرودِ سحر آفرین، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۲۰۰۷ء، ص ۸۔

۱۶۔ایضاً، ص ۸

۱۷۔ایضاً،صفحات ۹-۱۰

۱۸۔ایضاً،ص ۱۱۔

۱۹۔ پروفیسر اسلوب انصاری، ''اقبال کا اسلوب بیان'' اقبالیات، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، شمارہ نمبر ۱، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص، ۱۰

۲۰۔ جامعہ کشمیر اور اقبالیات، صفحات، ۲۷۴-۲۷۵۔

۲۱۔سرود سحر آفرین، ص ۱۶۔

۲۲۔ایضاً،ص، ۱۹

۲۳۔ایضاً،صفحات، ۲۰، ۲۴، ۲۵۔

۲۴۔ایضاً،صفحات ۲۹-۳۰۔

۲۵۔ایضاً،ص ۳۵۔

۲۶۔ایضاً،ص ۳۷۔

۲۷۔ایضاً صفحات ۳۷-۳۸

۲۸۔ایضاً،ص ۴۶۔

۲۹۔ایضاً،ص ۴۵۔

۳۰۔ایضاً،ص ۴۶، ۴۹۔

۳۱۔ایضاً،ص ۱۴۳۔

۳۲۔ایضاً،صفحات ۱۴۶-۱۴۸۔

۳۳۔ایضاً صفحات ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱۔

۳۴۔ایضاً،ص ۱۵۱۔

۳۵۔ایضاً ص، ۱۵۱

۳۶۔ایضاً،صفحات ۵۴، ۵۶، ۵۷۔

۳۷۔ایضاً، ۵۷۔

۳۸۔ایضاً،۵۸۔

۳۹۔ایضاً،ص۵۹۔

۴۰۔ایضاً،صفحات،۶۱-۶۶

۴۱۔ایضاً،ص۶۷۔

۴۲۔ایضاً،صفحات،۶۸-۶۹۔

۴۳۔صفحات،۷۸-۷۹۔

۴۴۔''تقدیم'' سرودِ سحر آفرین، طبع پاکستان صفحات ۲-۳۔

۴۵۔Muslim World Book Review, London, Vol.15, No: 2, 1995, p.02

عبدالاحد آزاد پر اقبال کے اثرات

ڈاکٹر نذیر آزاد

اردو میں سرسیّد، حالی اور آزاد کے ہاتھوں افادی ادب کا جو خاکہ تیار ہوا اُس کو اقبال نے عملی طور پر اور کامیاب شعری وسائل کے ساتھ پیش کیا۔ چنانچہ کشمیر میں بھی برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح اقبال کی شاعری کا چرچا اُن کی زندگی میں ہی پہنچا تھا۔ یہاں کی مذہبی، سیاسی اور تجارت پیشہ شخصیتوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے شعراء کے ساتھ اقبال کے روابط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اُنہیں نہ صرف کشمیر کے سیاسی اور ثقافتی مسائل سے دلچسپی تھی بلکہ کشمیر کے شاعروں نے بھی اُن سے اخذ وقبول کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اقبال کے اثرات کا یہ سلسلہ جو مہجور اور آزاد سے شروع ہوا تھا کشمیر کی شعری روایت کا ایک اہم حصّہ بن گیا جو کہ آج تک یہاں کے شعری سماج میں کبھی واضح طور پر اور کبھی زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ کسی کے یہاں اقبال کے نظریات کی گہری چھاپ ہے تو کسی کے یہاں اقبال کا لب ولہجہ نمایاں ہے۔ اگر کسی نے اقبال کے افکار وتصوّرات سے دامن چھڑا بھی لیا لیکن وہ اقبال کے استعاروں اور پیکروں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اقبال کے افکار کی بازگشت کشمیر میں کی جانے والی اردو اور کشمیری شاعری میں سُنائی دیتی ہے۔ فکرِ اقبال کی کشمیر میں اِس مقبولیت کے پسِ پردہ کشمیر کے لئے اقبال کی والہانہ محبت کے ساتھ ساتھ یہاں کے سیاسی اور ثقافتی حالات بھی اہم ہیں لیکن اگر صرف بات یہیں تک محدود ہوتی تو ترقی پسندی اور جدیدیت کے زمانوں میں اِس ضمن میں کمی واقع ہوئی ہوتی۔ لیکن اِسکے برعکس ہر گذرتے لمحے کے ساتھ ساتھ اقبال کی شعریات کی معنویت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کشمیری شعراء میں اقبال سے فوری طور پر متاثر ہونے والے شعراء میں اگرچہ مہجور پیش پیش ہیں لیکن شعریات اِقبال کو کامیابی کے ساتھ برتنے میں بڑی حد تک عبدالاحد آزاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اگرچہ مہجور نے کہیں کہیں ادب کی مقصدیت کو زیرِ نظر بھی رکھا لیکن اُن کے یہاں کلاسیکی شاعری کا رچاؤ زیادہ تر غالب ہے۔ مہجور کے ہاں غالب کی طرح کی شعری وحدت ہے جبکہ آزاد کے یہاں اقبال کی طرح کی مخصوص شعری وحدت۔ ایسی مخصوص وحدتیں دانتے، ملٹن، ٹیگور، یے ٹس

اور ایلیٹ کی شاعری میں بھی موجود ہیں ایسی شاعری کو بھی بڑی شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ فکرِ اقبال کی ہمہ جہتی اور شعرِ اقبال کی گہرائی عبدالاحد آزاد کے ہاں نہیں مل سکتی ہے کیونکہ فکرِ اقبال کے سرچشمے عظیم تھے اور اُن کی شعریات مشرقی شعریات کے بحرِ زخار کی پروردہ تھی۔ لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ اقبال کی فکر کے ساتھ ساتھ اُن کے فن کے اثرات آزاد کی شاعری میں سب سے زیادہ واضح ہیں۔

آزاد پر اقبال کے نظریات کا اثر کس حد تک پڑا اس پر بات کرنے سے قبل یہ دیکھنا ہے کہ اقبال نے آزاد کے ساتھ ساتھ کشمیر کے شعری سماج کو شعر کی حد تک کس قدر متاثر کیا۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں ہمیں مشرق و مغرب کے بیسیوں شعراء کے نام یا حوالے ملتے ہیں۔ ان سے ہمیں اقبال کے تصورِ شعر اور اسکی افادیت کے سراغ مل سکتے ہیں۔ یہ شعراء افکار و نظریات کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ ان میں وہ تخلیقی حرکیت مشترک ہے جو کہ اقبال کا مقصود و مطلوب تھی۔ اقبال ایک جگہ پر بیدلؔ کو غالب پر اس لئے فوقیت دیتے ہیں کہ بیدلؔ کا تصوف حرکی ہے جبکہ غالبؔ کا تصوف سکونی۔ لیکن دوسری جگہ پر اقبالؔ کو غالبؔ فلکِ مشتری پر یہ غزل پڑھتے ہوئے ملتے ہیں۔

ے زحیدر یم من و تُو ، زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگر دانیم

اسی طرح حافظؔ کی شاعری پر اقبالؔ کا بنیادی اعتراض اِس کی انفعالیت کی وجہ سے ہے۔ اور نظیریؔ کی فعالیت کو اقبال اِس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

ے بہ مُلک جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شُد از قبیلۂ مانیست

کشمیر کے اولین اقبال شناس شاعر عبدالاحد آزاد کے ہاں اقبال کی اِس تخلیقی حرکیت کا عکس اُن کی نظم دریاؤ (دریا) میں صاف نظر آتا ہے۔

ے پُنن سوزا پنن سازا پُنن شوقا تہٗ آوازا

پنن چھم لولہ انداز، سرودا ، مسیتا ، نازا
درن ، پاں زادرن ، جوین ، سرن، آرن، کولن اندر
یواں چھم زندگی ہند ساز سفرن منزلن اندر

(میں اپنا سوز و ساز، اپنا شوق اور اپنی آواز رکھتا ہوں۔ میرے عشق کا انداز' میرا سرور' میری مستی اور میرا ناز اپنا ہے جو کہ آبی دروں، آبشاروں، جوئباروں، تالابوں اور ندی نالوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے زندگی کا لطف سفروں اور منزلوں میں ملتا ہے)۔

آزاد کی اِس طویل نظم میں از اوّل تا آخر لہجے کی بلندی اور شکوہِ الفاظ کا وہی سماں دیکھنے کو ملتا ہے جو اقبال کی نظموں کی بنیادی صفت ہے۔ آبشاروں کی طرح پھلانگتا ہوا اور کناروں کو توڑتا ہوا بجلیوں کی طرح کڑکتا ہوا اور سیماب کی طرح تھرکتا ہُوا دریا کا یہ حرکی پیکر آزاد کی شاعری کی بنیادی علامت ہے۔ یہ علامت نہ صرف آزاد کی شعری فضا میں کلیدی اہمیت کی حامل ہے بلکہ اِس سے آزاد کے تصورِ شعر اور اُسکے فکری زاویے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اِس کو پڑھ کر بے ساختہ اقبال کی ''موجِ دریا'' یاد آتی ہے۔

میں اُچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دِل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

اقبال اور آزاد کی ان نظموں کی حیرت انگیز مماثلت کے باوجود آزاد کی نظم کو فکرِ اقبال کا چربہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کی فعالیت دو الگ الگ فکری انتہاؤں پر منتج ہوئی ہے۔ اقبال کی موج دریا کی خواہش بحر میں انضمام ہے جبکہ آزاد کی علامت یعنی دریا کی تمنا اور مقصود اپنے قائم بالذات وجود کی پہچان قائم رکھنا ہے۔

دراصل اقبال نے حرکیت کی یہ شعریات غالب اور اُن کے توسط سے بیدل سے حاصل کی

ہے۔ یہ شعری حرکیت صرف خارجی احوال کی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ اس سے اُن کی جذباتی اور تخلیقی توجیہہ بھی سامنے آتی ہے۔ یہی خارجی اور باطنی احوال و جذبات کی آویزش ہمیں آزاد کی نظموں پاں ژادر (ردائے آب)، شنہ ءمانی (برف کا تودا) وتھ (جہلم)، بہار، شکوۂ ابلیس اور شکوۂ کشمیر میں ملتی ہے۔ آزاد کی اِس حرکیت اور فعالیت کے پس پردہ اقبال کا تصورِ شعر ہے۔ انہوں نے شعر کو جزو پیغمبری بھی گردانا ہے اور شاعر کو خالق و پروردگارِ آرزو بھی مانا ہے۔ اُن کے نزدیک معجزۂ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ اور انہوں نے شعر کو ایسے حرفِ تمنا سے بھی تعبیر کیا ہے جسے رو برو نہ کہا جا سکے۔ اِسی طرح آزاد بھی شعر کو جزو پیغمبری مانتے ہیں جس سے ایک طرف آدم گری کا کام لیا جا سکے تو دوسری طرف مردہ دِلوں میں روح پھونکی جا سکے۔

ے تیرہ کے تاثیر زن تقریر آزادن گرن
درد چھا، خونِ جگر چھا شعر چھا الہام چھا

(آزاد کی تقریر میں جیسے تیر کی تاثیر ہے۔ کیا یہ درد ہے یا خونِ جگر ہے یا شعر ہے یا الہام ہے)

ے تس دردہ غزل خوانس صد حیف ہزار افسوس
یس خام خیالن پیٹھ آرام دِلگ راوے

چنانچہ آزاد کے تصورِ شعر میں زبان اور موسیقیت کی وہ ہم آہنگی ملتی ہے جس سے شاعرانہ صداقت اور تصدیق پذیر صداقت میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ شاعری اور موسیقیت کا یہ امتزاج اقبال کے ہاں وافر تعداد میں ملتا ہے اور یہ موسیقیت نہ ہی قافیہ پیمائی کا نتیجہ ہے اور نہ ہی مترنم بحور و اوزان کی مرہونِ منت ہے۔ بلکہ اِس کے پیچھے ڈرامائیت، استفہام، الفاظ کا صحیح انتخاب و ترتیب کارفرما ہوتی ہے۔ آزاد اور مہجور سے قبل کشمیری شاعری اُسی انفعالیت کی شکار تھی جو کہ اردو شعریات کی پہچان بن گئی تھی۔ حالانکہ کشمیری شاعری میں رسول میر نے روایتی شعری کردار کو مردِ غوغا بنانے کی کوشش کی تھی اور بقول محمد یوسف ٹینگ ویررس اور شرنگاررس کو آپس میں آمیز کیا تھا لیکن یہ صرف روایت سے انحراف تھا نہ کہ روایت کی تقلیب ماہیت۔ لیکن آزاد نے اقبال کے اثر کے تحت نہ صرف شعری کردار کو ہادی و رہنما کے روپ میں پیش کیا بلکہ اِسے صحیح معنوں میں نظیری کا مردِ غوغا بنانے کی بھی کوشش کی۔

خیالن ہنز بُلندی چھاویپاں کمزور لفظن منز
چُھہ ژوبنی ہئی لال نادانا براں آمین پنن اندر

(بلندیٔ خیالات کمزور الفاظ میں نہیں سما سکتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ کوئی ناداں دُرِ سفتہ کو کمزور دھاگے میں پروئے)

آزاد نے جس بلند آہنگی میں مضمون عالی کو پیش کرنے کا تصور کشمیری شاعری میں متعارف کیا اُس کو بعد میں ترقی پسندوں نے ایک اہم شعری وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لفظوں کے درو بست اور شعر بطور لسانی اکائی اور استعارے کی معنی آفرینی پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اکثر اوقات اُسی طرح نعرہ بازی کا شکار ہوئے جس طرح مہجور اور آزاد انقلاب کی بات کرتے ہوئے شکار ہو جاتے ہیں۔

تخلیقی حرکیت اور تصورِ شعر کے بعد آزاد نے اقبال سے جس چیز کا استفادہ کیا وہ ہے خطابیہ لہجہ۔ اقبال سے پہلے بھی اگرچہ اردو فارسی شعری روایت میں خطابیہ اور ندائیہ اسلوب موجود تھا لیکن اِس کی نوعیت انفرادی تھی۔ اِس میں متکلم کا مخاطب روایتی محبوب تھا۔ اگر تخاطب میں تھوڑی سی وسعت لائی بھی جاتی تھی پھر بھی یہ ساکنانِ کوچۂ دلدار یا پورب یا پچھم کے ساکناں یا زیادہ سے زیادہ اپنے دوستوں اور غم گساروں تک محدود رہتا۔ اقبال نے امتوں، ملتوں اور مختلف گروہوں کو اپنے تخاطب کے دائرے میں لایا۔ جہاں جہاں اقبال ظاہری طور پر فرد سے مخاطب ہوتے ہیں وہاں وہ یا تو کسی گروہ (ان گروہوں میں جن و اِنس کے علاوہ قُدسیاں بھی شامل ہیں) سے راہِ سخن وا کرتے ہیں یا رفتگاں و آیندگاں سے مکالمہ کرتے ہیں۔ کشمیری میں بھی مہجور نے خطابیہ لہجہ اختیار کر کے اقبال شناسی کا ثبوت دیا لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ مہجور آزاد وحدت کے شاعر تھے اسلئے اکثر اوقات میں اُن کا مخاطب روایتی محبوب ہی رہتا ہے۔ اسکے برعکس آزاد نے شعوری طور پر نہ صرف خطابیہ اسلوب منتخب کیا بلکہ صفِ سامعین میں جن و اِنس کے علاوہ فہم و ادراک سے عاری اشیاء کو بھی رکھا۔ اتنا ہی نہیں آزاد کی شعریات میں اقبال ہی کی طرح انجم و کواکب بھی نہ صرف مخاطبین بلکہ متکلمین میں شامل ہیں۔ جہاں اقبال کا لالۂ صحرا اُن کی شعریات میں بنیادی علامت کی حیثیت رکھتا ہے وہیں شنہ مانی (برف کا تودا)، آرہ ول (ایک قسم کا زرد پھول جو کہ خودرو ہے اور بہار کا

نقیب ہے)' پاں ژادر (ردائے آب) اور ویتھ (جہلم) علامتی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان اشیاء کو آزاد نے سامعین اور مخاطبین میں رکھا ہے۔ چونکہ جینوین شاعر کی یہ ایک پہچان ہے کہ وہ انفس و آفاق کی بات کرتے ہوئے مقامیت کو بھی زیرِ نظر رکھے اور اسے اپنی تخلیقی کارکردگی میں استعمال کرے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں ایران و توران اور حرم و حجاز اور سمرقند و شیراز کو حوالوں کی حیثیت میں برتا لیکن انہوں نے دلّی اور وادیٔ لولاب کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ آزاد کی اوریجنلٹی (Originality) اس بات میں بھی ہے کہ انہوں نے مقامی سطح کی علامتوں میں آفاقی رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

خطابیہ اسلوب کے علاوہ آزاد نے اقبال کے ڈرامائی طرزِ بیان سے بھی استفادہ کیا۔ اس سلسلے میں جہاں اقبال کی نظموں ''پیرِ رومی مریدِ ہندی''، ''مکالمۂ جبریل و ابلیس'' جیسی نظموں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے وہیں آزاد کی نظمیں ''لول تہ ءگاٹہ جار'' (عشق و عقل) اور ''پیام انقلاب'' کو مُشتے از خروارے پیش کیا جا سکتا ہے۔۔ آزاد کی نظم ''لول تہ ءگاٹہ جار'' میں اگرچہ اقبال کے افکار کی بازگشت سُنائی دیتی ہے تاہم اِس نظم میں آزاد نے کشمیر کے روزمرہ کو خلاقانہ طور پر استعمال کیا ہے۔

ے عشق سراپا یقین، عشق نہ ءِ مذہب تہ دین
عقلہِ روٚ پکھ گُر تہ زین، لولہِ جنون شہسوار

(عشق سراپا یقین ہے۔ یہ دین و مذہب سے بالاتر ہے۔ عقل کو ابلق اور اس کا زین قرار دیا گیا ہے جبکہ اس پر عشق اور جنوں سوار ہے)۔

آزاد کی تخلیقی سرگرمیوں میں طنزیات کی زبردست اہمیت ہے۔ چنانچہ آزاد اقبال ہی کی طرح ایک مخصوص مکتبِ فکر سے وابستہ تھے اسلئے اُنہیں اس ہتھیار کی جا بہ جا ضرورت محسوس ہوئی۔ اقبال کے ظریفانہ کلام سے خصوصاً جو انہوں نے پیروئ مغرب کی رد میں کہا ہے، ہم واقف ہیں یہاں پر آزاد کے ایک قطعہ کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ے ونو کیا مغربُک پرتو تُھے روٚمت چھہ سمسارن
اپاری زونہِ افتابس بہادر سائی ما کھارن

یہ زور آور کشش کا ژاچھے تھ رنگس تہ رویس منز
بہ چھس کھوژاں نوم صاحب کرن ماماً نز رخسارن

(کیا کہیں کہ مغرب کی تقلید کس طرح پوری دُنیا میں ہو رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے بہادر مہر و مہ کو وہیں سے طلوع کریں۔ اُس رنگِ رخسار کی کشش اس قدر ہے کہ مجھے خوف ہے کہ ہمارے صاحبان اپنے چہروں کو رنگ حنا سے نہ رنگیں)

اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو اور فارسی شاعری میں نئے افکار و تصورات کا اضافہ کیا اور اسکی مروجہ شعریات کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہ بات طے ہے کہ اقبال کی غزلوں میں بھی نظموں کا سا تسلسل ہے اور ان کے اشعار غزل کی طرح خود مکتفی ہیں۔ اقبال کی غزلیں غزل اور نظم کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ اِس سلسلے میں بعض نقادوں کی اِس بات سے اتفاق کی گنجائش کہ اس صنف میں کہے گئے اشعار کے اوپر غزل کے بجائے نمبر شمار لکھ کر اور بعض اوقات لندن میں لکھے گئے یا پیرس میں لکھے گئے عنوان دے کر اقبال نے انہیں غزلیں نہیں قرار دیا ہے۔ ہر چند کہ آزاد نے نظموں کو بھی غزلیں کہا ہے لیکن اُن کی غزلوں میں نظموں کا سا تسلسل موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس طرح اقبال فارسی اور اردو اصناف کی حس بندیوں کو توڑنے میں مصروف تھے اُسی طرح آزاد نے بھی تنگ نائے غزل کو بحرِ بے کراں میں تبدیل کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔

جہاں تک اقبال اور آزاد کے درمیان افکار کی مماثلت کا تعلق ہے تو اِس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد کے کفر و الحاد کا اِس حد تک چرچا کیا گیا اور ان دو شعراء کو اس طرح خانوں میں رکھا گیا کہ ان کے درمیان مماثلت تلاش کرنے کی راہیں مسدود کی گئیں۔ چنانچہ اقبال کی شاعری کے پیچھے عقیدے کا زبردست عمل دخل ہے اور مذہبیات اُن کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کے برعکس آزاد کے ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن سے اُن کی دین بیزاری کا التباس ہوتا ہے۔ اِس سے قبل کہ آزاد کے افکار و خیالات پر بات کی جائے یہ ضروری ہے کہ اقبال کی نظم مکالمہ ''جبریل و ابلیس'' پر تھوڑی گفتگو ہو۔ اِس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے وارث علوی لکھتے ہیں:۔

''اس نظم پر جتنا ادبی نقادوں نے لکھا ہے مذہبی نقادوں نے نہیں لکھا۔ وجہ صاف ہے۔ حرکت و عمل کا تصور

اپنی فلسفیانہ حدود توڑ کر ایسی ڈرامائی صورت میں مبدّل ہو گیا کہ اِسے پھر مذہبی عقیدے کے فریم میں جکڑنا ممکن نہیں رہا۔ نظم ایک قائم بالذّات فن پارے کی طرح جگمگاتی ہے اور سرکشی کی جدلیات کو اِس قدر Explosive بناتی ہے کہ اِس کے شعلوں میں خود اقبال کے بعض Authoritarian عقائد جھلستے نظر آتے ہیں''۔

(وراثت علوی۔ شاعری، فلسفیانہ شاعری اور اقبال مشمولہ اقبال کا فن ص ۲۴۱)

اس پس منظر میں اگر آزاد کی نظم شکوۂ ابلیس کو دیکھا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ اِس میں آزاد کے بعض عقائد، افکار اور نظریات بھی جھلستے دِکھائی دے رہے ہیں۔ نظم کے پس منظر میں خود آزاد بولتے دِکھائی دے رہے ہیں جس سے آزاد کی گہری مذہبیت اُبھر کر پیش منظر پر آئی ہے۔ یہی حالت آزاد کی دوسری نظموں میں بھی سامنے آتی ہے۔ آزاد کے مذہبی پس منظر کے بارے میں رفیق رازؔ نے اپنی کتاب کاشر شاعری، ''زبان تہ عروض'' میں بعض اشارے کئے ہیں لیکن اِس سلسلے میں تفصیلی تجزیے کی ضرورت ہے۔ آزادؔ کی نظم شکوۂ ابلیس کے چند اشعار دیکھئے۔

یہ جلد بازی چھے کارِ شیطان ژے کیا ونے چھُکھ رحیم رحمان
کتھن لگان لُکھ، ذلیل گژھان لُکھ ژے نے عیالانہ خاندان

(جلد بازی تو کارِ شیطان ہے تم کو کیا کہوں تُم تو رحیم و رحمان ہو۔ لوگ تو باتوں باتوں میں ذلیل ہوتے ہیں لیکن تمہارا نہ کوئی عیال ہے نہ خاندان ہے)

میے چانہِ شانک لحاظہٗ ماراں نہ چھُس بہ کھوژاں نہ چھُس بہ تھاراں
بہ چھُس تہِ زاناں ژنے چھے خدائی ژے چھُی زمینا تہ آسمانا

(نہ ہی مجھ میں خوف ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ہچکچاہٹ ہے البتہ مجھے تیری شان کا لحاظ روکے رکھتا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تو خدائی کا مالک ہے اور ارض و سماوات تیرے ہیں)

ژے پیدہ کورتھن تھیکیتھ یہ آدم ادہ بنوؤتھ یہ سوری عالم
تسند عیشہ تہ ارامہ باپتھ تھو وُتھ سجاوتھ یہ کار خانا

(تو نے آدم کو فخر کے ساتھ تخلیق کیا اور بعد میں پورا عالم بنایا۔ اُس کے عیش و عشرت کے لئے تو نے اس

کارخانے کو سجادیا)

اِس نظم میں اگرچہ ابلیس کی سرکشی کو پیش کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی آزاد نے ابلیس کی زبان سے توحید، رسالت، خدائی، بندگی، زمین و آسمان میں خُدا کی قدرت، خُدا کی تخلیقیت، انسان کا مٹی سے اور جنّات کا آگ سے پیدا ہونا جیسے خالص اسلامی نظریات و عقائد بھی خلاّقانہ انداز میں نظم کیے گئے ہیں۔ ان افکار سے آزاد کی مذہب کے ساتھ وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ نظم میں ابلیس اللہ سے شکوے بھی کرتا ہے لیکن ان شکوؤں میں وہی حُزن و ملال ہے جو کہ اقبال کی نظم ''شکوہ'' میں نظر آتا ہے۔ اس سرکشی کی کیفیت کا سامنا کم ہی ہوتا ہے جو کہ ''مکالمہ'' جبریل و ابلیس'' میں اُتھل پُتھل پیدا کرتی ہے۔ بنیادی طور پر آزاد نے فکرِ اقبال کے علامتی اور رمزیہ اسلوب میں اپنے افکار پیش کرنے کا طریقہ حاصل کیا۔ آزاد کے مذہبی پس منظر کی مثالیں ہمیں اُن کی شاعری میں جگہ جگہ پر ملتی ہیں۔ اس ضمن میں آزاد کی نظم ''مارکسزم'' بطورِ خاص قابلِ توجہ ہے۔

یم خیال اُسی عالم پاکس اندر نقش کری کریتم وُچھن خاکس اندر
کافری منز دراو دینگ انقلاب نور تمی سُند وحدتچ گنرچ کتاب
نون کوڈن جذباتہ کتویر دوتلہ عشق موسیٰ کوہ طورچ مشعلہ
زندگی ژوّل لن ترانی ہند تھکن برونتھ گن ہیوت عاشقو رندو پکن
کافرِ بیدارِ دِل روشن دماغ کفرہ سیتی روشن کورن دینگ چراغ

(جو خیالات عالمِ پاک میں تھے اُس (مارکس) نے اُن خیالات کو مٹی میں نقش کر کے دِکھایا۔ اسطرح کافری سے دین کا انقلاب آیا اور اِس سے وحدت کی کتاب منوّر ہوگئی۔ عشق موسیٰ اور مشعل طور کو اُس نے جذبات کے پردوں سے باہر نکالا۔ زندگی سے لن ترانی کی تھکن دور ہوئی اور عاشقوں اور رندوں نے آگے بڑھنے کی ٹھان لی۔ وہ ایسا بیدار دِل اور روشن دماغ کافر تھا جس نے اپنے کُفر سے دین کے چراغ کو روشن کیا)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نظم کارل مارکس اور کمیونسٹ انقلاب کے بارے میں ہے لیکن نہ ہی اس میں جدلیاتی مادیت کا حوالہ ہے اور نہ ہی پرولتاریت اور بورژوائیت کی اصطلاحیں نہ ہی سرمایہ و مزدور

جیسے الفاظ ہیں اور نہ ہی مذہب بیزاری کا کوئی جواز ہے۔ اسکے برعکس نظم کے تانے بانے مذہبی تلمیحات اور علامات سے تیار کیے گئے ہیں۔ نور، وحدت، لن ترانی وغیرہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسمیں اقبال کی مرغوب ترکیب ''کافرِ بیداردل'' کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ نظم کو پڑھ کر اقبال کے مصرعے قوموں کی روش اور در بغل دارد کتاب بے ساختہ یاد آتے ہیں۔ اِس سے نہ صرف آزاد کی گہری مذہبی وابستگی سامنے آتی ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے اقبال کی ''مارکس'' اور ''لینن خدا کے حضور میں'' جیسی نظموں کا صاحب فہم قاری کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے اور صاحب ہنر شاعر کی طرح ان خیالات کو پیش کیا ہے۔ مذہبی تلمیحات، قرآنی اصطلاحات اور اسلامی تعلیمات آزاد کی نظموں کے علاوہ اُن کی غزلوں میں بھی ملتی ہیں۔ جہاں تک کہ آزاد کی دین بیزاری کا تعلق ہے تو اِس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد اقبال کی طرح Anti Ritual تھے جسکو اُن کے دشمنوں نے Anti religion قرار دیا۔

دوگنیار چھہ یلہِ مطلب پوزا یہ نمازن ہُند
سوزس بہ یہ بَخشائش بیہ توری لدتھ ڈالے

(اگر عبادت کا مقصد دوئی ہے تو میں اللہ کی اِس بخشش کو تحفے کی صورت میں ہی واپس بھیجوں گا)

شعر میں ظاہر پرستوں کی نمازوں سے پیدا ہونے والی دوئی کو نشانہ بنایا گیا ہے اور اسے نماز مخالف قرار دینا شاید ناانصافی ہوگی۔ اِس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اقبال نے مختلف جگہوں پر مُلّا، صوفی، واعظ یہاں تک کہ فلسفہ زدہ لوگوں پر طنز کیے ہیں اُسی طرح آزاد نے بھی فتنہ پرداز اور مذہب کے نام پر استحصال کرنے والوں پر جابجا چوٹ کی ہے۔

گُنے چھُ دفتر گُنے فسانہ مگرو چھتھ گردش زمانہ بناں آسمانہ چین کتابن چھے آسمانی کتابہ دشمن

(دفتر تو ایک ہی ہے اور فسانہ بھی ایک ہے لیکن گردشِ زمانہ کو دیکھ کر آسمانی کتابیں آسمانی کتابوں کی دشمن بنتی ہیں)

یہی بات ہے کہ اقبال کو اپنے شاندار ماضی کے احیاء کی خواہش پر رجعت پسند کہا گیا اور آزاد کو ایسے افکار پر ملحد قرار دیا گیا۔

وَنے نہ بوزُم پیام رومی دپے نہ زونم امام رازی
نے چھے آخر وزاں پیہم ژو پاری ساری گمتی زری چھا

(میں تجھے کہوں گا کہ نہ میں نے پیام رومی سُنا اور تجھے بتاؤں گا کہ میں نے امامِ رازی کو نہیں جانا۔ حالانکہ وہ نئے چار سو گو بختی ہے لیکن سب کے سب بہرے ہو گئے ہیں)

جہاں تک اقبال کی فکر اور اُن کے موضوعات کا آزاد پر اثرات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے اقبال کی اندھی تقلید نہیں کی ہے۔ انہوں نے اقبال کے بعض نظریات کو قبول کیا اور بعض سے انحراف کیا۔ اگر آزاد اقبال کے تمام نظریات کو قبول کرتے تو انہیں بلاشبہ کشمیر کا سب سے بڑا اقبال شناس کہا جاتا لیکن اِس سے اُن کے فکری تار و پود اور اُن کی شاعرانہ سچائی پر بہت بڑا سوالیہ نشان کھڑا ہوتا۔ آزاد پر فکر اقبال کی کمیت اور کیفیت پر بات کرنے سے قبل میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

''اگر اقبال کی فکری انفرادیت اُن کی شاعرانہ انفرادیت کے تحت نہ رکھی جائے بلکہ اسے قائم بالذّات مان لیا جائے تو پھر اقبال کے کلام کی مُفصّل شرح یا اُن کی نظموں کی توضیح کافی ہے، اصل کلام کے مطالعے کی ضرورت نہیں ادب میں استعمال ہونے والی زبان مکمل معنویت کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف بے کار یا برائے بیت نہیں ہوتا وہ معنویت پوری پوری کسی اور لسانی ترتیب حتیٰ کہ فن پارے میں بھی نہیں سما سکتی''۔

(فاروقی۔ اقبال کا لفظیاتی نظام۔ (مشمولہ) اقبال کا فن ص ۱۹۰)

اس تناظر میں اگر اقبال سے آزاد کی فکری مستعاریت کو دیکھا جائے تو یہ سلسلہ اقبال تک محدود نہ رہ کر ملٹن، دانتے، گوئٹے اور رومی تک وسیع ہو سکتا ہے۔ آخر پر اقبال کے ان بعض تصورات اور اُن علامات کو پیش کروں گا جن کو آزاد نے اپنے فکر و فن میں جذب کیا۔ اقبال کے ان تصورات سے آپ سب واقف ہیں

ڈراں یُس بندہ پوزونہ نس تھوِن زُنار بیہ تسبیح
چھُ پیرا پیر صابن سیتی برہمن برہمن اندر (سبھاش چندر بوس)

(جو بندہ حق گوئی سے ڈرے اُسے زنار اور تسبیح رکھنی چاہیے تاکہ وہ ملاؤں میں سے ایک یا برہمنوں میں سے ایک ہو سکے)

زمانہ کا تیاہ کراں چھہ گردش نہ چھُس ارامانہ چھُس قرار
کمن بہارنی کران دُدوَن اناں کمن دُدُ ونن بہارا
امیک یہ گردش امیک یہ قانون ژندر ژو داہم تہ کنتر ہم زون
نہ اتھ کالس تہ ِ اعتبارا نہ اتھ زوالس تہِ اعتبارا

(زمانہ گردش میں ہے۔ نہ اسے آرام ہے اور نہ ہی قرار ہے۔ یہ بہاروں کو خزانوں میں تبدیل کرتا ہے اور خزانوں میں بہار لاتا ہے۔ اسکی گردش اور اسکا قانون کبھی بدرِ کامل میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی اماوس کی رات میں۔ نہ ہی اِس کمال پر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اِس زوال پر)

یمہِ عقلہِ ہندی زوالانہ بہ ِکتھ پاٹھی ژٹتھ دراس
یا زلنہِ یہ پان میون تہ نتہ زلنہِ مژر میون

(عقل کی زنجیروں کو میں توڑ کے کس طرح نکل سکا اُسکی خبر یا میرے وجود کو ہے یا میرے جنون کو)

گُنے پرواز طوطس بُلبلس کاوس تہ شہبازس
ولیکن وُچھ تفاوت کثر پروازس تہ پروازس

(طوطے، بلبل، کوے اور شہباز کی پرواز اگرچہ ایک جیسی ہے لیکن ان میں زبردست تفاوت ہے)

اِس کے علاوہ آزاد نے اقبال سے خودی، شمشیر و سناں، طاؤس و رباب، شاہین، تقدیر، کشمیر، اور ایسے دوسرے موضوعات مستعار لئے ہیں جو کہ ان کی تخلیقی حرکیت میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نہ صرف کشمیر کے ابتدائی اقبال شناسوں میں سرفہرست ہیں بلکہ انہوں نے اقبال کے اثرات کو کشمیری شاعری میں متعارف کر کے یہاں کی شعریات کی کایا پلٹ دی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس

ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

برصغیر کی تقسیم کے بعد جموں وکشمیر میں اقبالیات کے حوالے سے جن مہاجر علمی شخصیات نے نمایاں خدمات انجام دیں، اُن میں دو دانشوروں کے اسمائے گرامی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے قلمبند کی جائیں گی۔ یہ دو علمی ہستیاں پروفیسر آل احمد سرور مرحوم اور آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد ہیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سچدانند سنہا کی انگریزی تصنیف زیر عنوان "Iqbal: The Poet And His Message" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے دو باتوں پر زیادہ بحث کی تھی۔ ایک یہ کہ اقبال کے کلام میں نغمگی کی کمی ہے اور دوسری یہ کہ اقبال کا کلام صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور اس میں کوئی عالمگیر اپیل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف معروف غیر مسلم اقبال شناس جگن ناتھ آزاد نے اپنی مقتدر تصانیف میں علامہ اقبال کو بحیثیت ایک عظیم انسانیت نواز شاعر بہترین فن کار اور عالمگیر مفکر قرار دیا ہے۔ [۱]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے یقیناً نہ صرف کشمیر میں بلکہ ہندوستان بھر میں ۱۹۴۷ء کے بعد اقبالیات کا نشاۃ الثانیہ کیا۔ آزاد نے ۱۹۵۴ء میں کشمیر یونیورسٹی سرینگر جو اُن دنوں جموں وکشمیر یونیورسٹی کہلاتی تھی، اقبال پر تین توسیعی خطبے دینے چاہے تھے اور جامعہ کشمیر کے اُس وقت کے وائس چانسلر جناب آصف علی اصغر فیضی صاحب کی طرف سے انھیں اس سلسلے میں باضابطہ طور پر دعوت نامہ بھی موصول ہو چکا تھا لیکن آپ چونکہ محکمہ انفارمیشن میں ایک آفیسر کے طور پر کام کر رہے تھے اور اُن کے آفیسر بالا نے انھیں تین دن کی رخصت پر آپ کو سرینگر آنے کی اجازت تک نہیں دے دی۔

بہر کیف پروفیسر آزاد نے کشمیر میں اقبالیات پر جو تین خطبات پڑھنے کی تیاری کی تھی، انہی کو انھوں نے بعد میں کتابی شکل دے کر ادارۂ انیس الہ آباد سے ''اقبال اور اس کا عہد'' کے عنوان سے منظر عام پر لایا۔ یوں آپ نے آزادیٔ ہند کے بعد یہاں اقبالیات کو نشاۃ الثانیہ دے دیا۔ اس کتاب میں آپ نے تین عنوانات پر

مشتمل علامہ اقبال کے حوالے سے ایک شاندار محققانہ مقالہ پیش کیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت آپ نے ''کلام اقبال کا ہندوستانی پس منظر'' سے جائزہ پیش کیا ہے دوسرے عنوان کے تحت آپ نے ''کلام اقبال کا صوفیانہ لب ولہجہ'' پیش کیا اور تیسرے عنوان کے تحت آپ نے مذکورہ کتاب کے عنوان کے مطابق ''اقبال اور اس کا عہد'' پر ایک سنجیدہ اور محققانہ جائزہ لیا ہے۔

اس سلسلے میں آزاد ایک جگہ کلام اقبال کی ہمہ گیری اور عظمت کا تذکرہ ایک جاندار تنقیدی پیرائے میں یوں کرتے ہیں۔

''کلام اقبال ایک انسان کا کلام ہے اور اسے اسی خیال سے پڑھنا لازمی ہے۔ اس کلام پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری نہیں بلکہ دوسرے بڑے شعرا کے کلام کی طرح ہمیں اس کے حُسن وقُبح کو اپنی پَرکھ کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھنے کا حق حاصل ہے''۔ ۲

مذکورہ بالا کتاب پر مولانا عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتحپوری مرحوم نے آزاد صاحب کی زبردست پذیرائی فرمائی تھی اور کتاب کو سراہتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے یوں اپنا جاندار تبصرہ فرمایا تھا کہ ''جگن ناتھ آزاد شاعر ہی اچھے نہیں بلکہ نثر کے بھی اچھے اور سُلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں۔ اُن کے یہ تین لیکچر شعر و ادب، نقد ونظر اور اسلامیات کے طلبا کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ سلیس شگفتہ انداز میں باتیں خوب پتے کی کہہ گئے ہیں اور حقیقت تصوف وغیرہ کے سلسلے میں باتوں باتوں میں تو جابجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم کیا معنی مسلم فاضلوں کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں'' ۳

یہ کتاب اتنی مقبول ہوگئی کہ اس کا آٹھواں اڈیشن بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں آزاد صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں دہلی سے تبدیل ہو کر واردِ کشمیر ہوئے اور تب سے وہ مختلف حیثیتوں سے جموں وکشمیر ہی میں مقیم رہے۔ علامہ اقبال پر جگن ناتھ آزاد کی ایک مستند اور معتبر کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کو استناد کا درجہ حاصل ہے جو انھوں نے پہلی بار ۱۹۷۵ء میں ہندوستان سے شائع کی اور پھر لگاتار ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۴ء میں مکتبہ عالیہ لاہور پاکستان سے شائع ہوتی رہی۔

آزاد صاحب نے اس کتاب میں گیارہ مغربی مفکرین پر اقبال کے حوالے سے علمی اور تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے۔ جن میں فشٹے، شوپن ہائر، کارل مارکس، نٹشے، برگساں، دانتے، ملٹن، گوئٹے اور آئن سٹائن شامل ہیں۔

اس کتاب کے تمام مقالات اگرچہ اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن اقبال اور ''کارل مارکس'' والا مقالہ نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ میرے نزدیک یہی مقالہ اس تمام کتاب کا لُب لباب کہلانے کا مستحق ہے۔ آزاد صاحب کی کسرِ نفسی دیکھئے کہ حرف اول میں کہتے ہیں۔

''یہ کتاب ایک معذرت نامے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال اور مغربی مفکرین کے ذہنی قُرب وبُعد کا موضوع جس تفصیلی بحث کا متقاضی ہے، وہ اس کتاب میں نظر نہیں آئے گا''۔ ۴

حالانکہ معروف دانشور اور ماہر اقبالیات پروفیسر یوسف حسین خان اس کتاب کو تحریر کرنے پر انھیں یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ ''آپ نے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے۔ اس کیلئے آپ کو بہت پڑھنا پڑا ہوگا۔ آپ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ دلائل اور تجزیئے پر مبنی ہیں۔ میں بڑی حد تک ان سے متفق ہوں۔ آپ نے جن جن مفکرین کو چنا ہے ان کے تصورات کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں'' ۵

واقعی یہ کتاب آزاد صاحب کی ایک شہکار تصنیف ہے کیونکہ اس کتاب میں آپ نے علامہ اقبال کو بغیر کسی لاگ لپٹ کے محققانہ برہان سے اپنی اصلیت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے آل احمد سرور، سردار جعفری اور ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کے ان خیالات کو علمی اور تحقیقی شواہد سے غلط ثابت کیا ہے کہ۔ اقبال کبھی سوشلسٹ نظریہ کے طرفدار رہے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد پاکستان کے معروف قانون دان اے۔ کے بروہی کے مقالہ بعنوانِ ''اقبالی اجتہاد اور اسلامی سوشلزم کا نظریہ'' کے حوالے سے اپنی کتاب میں واضح کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے لہذا اس کے ساتھ کسی اور انسانی نظریۂ حیات کو ملانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ جواہر لال نہرو کی ان باتوں سے بھی شدید اختلاف کرتے ہیں جو انھوں نے دریافت ہند (Discovery of India) میں لکھی ہیں کہ ''عمر کے آخری حصے میں اقبال زیادہ سے زیادہ سوشلزم کے قریب ہوتے گئے سویت روس نے جو عظیم ترقی کی تھی وہ اس سے متاثر ہوئے اور اُن کی شاعری نے بھی ایک نیا رنگ اختیار کیا''۔

آزاد اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''جواہر لال نہرو کی اقبال سے ملاقات جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ یعنی اقبال کے انتقال سے تین ماہ قبل معلوم نہیں جواہر لال نہرو نے اقبال کی کس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں سوشلزم کے قریب

ہوتے چلے گئے حالانکہ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے نئے سال کا پیغام نشر کرتے ہوئے اقبال واضح طور پر یہ کہہ چکے تھے

''اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا'' ۶

مذکورہ کتاب کے اس مضمون کے حاشیے میں آزاد صاحب ایک اہم حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اقبال کو سوشلسٹ کہنا بعض پڑھے لکھے ہندوستانیوں کا ضعف ایمان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کے شوق میں اپنے آپ کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ کہلانا بھی پسند کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ہندو یا مسلمان بھی کہلائیں۔'' ۷

ارمغان حجاز کی معروف نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے حوالے سے آزاد صاحب اس بحث کو یوں سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال مغربی یورپ کے جمہوری نظام پر اشتراکی نظام کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر نظام سمجھتے ہیں''۔ ۸

علامہ اقبال پر آزاد صاحب کی تیسری اہم ترین کتاب انگریزی زبان و ادب میں Iqbal: Mind And Art کے نام سے ۱۹۸۳ء میں لاہور پاکستان سے اُس ملک کے ایک جید دانشور ڈاکٹر محمد معروف نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر محمد معروف نے طویل علمی دیباچہ رقم کرتے ہوئے مذکورہ کتاب میں شامل تمام چھ تحقیقی مضامین کا ایک بہترین علمی تجزیہ کر کے آزاد صاحب کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے مگر اس کے باوجود مصنف کی اس اعلیٰ تحقیقی کاوش کو کافی سراہا ہے۔ اُن کے خیال میں آزاد ایک ایسے غیر مسلم اور ہندوستانی دانشور ہیں جنھوں نے اقبال کا غیر متعصبانہ اور آزادانہ مطالعہ کیا ہے۔ یہ ان کے خلوص کا اظہار ہے۔ چنانچہ آزاد کے بارے میں وہ اس کتاب میں اہل علم حضرات سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

"Prof. Azad is a notable exception in that he has understood Islam through Iqbal's own eyes as is obvious from his writings.

His presentation of ISlam is relicable and his sincerity in this regard is most praiseworthy". (Iqbal: Mind and Art by J. N. Azad, P 37) اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن ہندوستان میں اور چار ایڈیشن پاکستان میں چھپ کر علمی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

آزاد صاحب کی چوتھی کتاب کا نام ''اقبال اور کشمیر'' ہے جو ۱۹۷۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے دو ایڈیشن ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۳ء میں لاہور کے مکتبہ علم و ادب مزنگ سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں آزاد صاحب سے بعض تحقیقی فروگذاشتیں ہو گئیں ہیں لیکن پھر بھی مصنف نے خاصی محنت سے یہ کام کیا ہے۔ عہد حاضر کے معروف اقبال شناس جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے خیال میں یہ کتاب اس موضوع پر موجود تینوں کتابوں میں بہتر معلوم ہوتی ہے البتہ غیر ضروری تفصیل اس میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ آزاد صاحب کی کئی اور ہلکی پھلکی کتابیں بھی اقبالیات میں اچھا اضافہ کہلانے کی مستحق ہیں''

۱۹۷۳ء میں آزاد نے ایک عظیم الشان اقبال نمائش سرینگر میں منعقد کرائی اور پھر یہی نمائش ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً دہلی، علی گڈھ، پٹنہ، ممبئی، تمل ناڑو، مدراس، چنڈی گڈھ، حیدر آباد، لکھنؤ اور ملک کے متعدد علمی و ادبی مراکز میں منعقد ہوئی۔ ایک سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہ نمائش کوئی تین لاکھ افراد نے دیکھی۔ آزاد صاحب اس نمائش کے تعلق سے ایک دلچسپ اور حیران کن واقعہ سناتے ہوئے ایک لیکچر میں کہتے ہیں:۔

''جب یہ نمائش زیر ترتیب تھی تو اس کے مرتب نے ملک کے انگریزی اور اردو اخبارات میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے تھے۔ علامہ اقبال کی بعض تحریروں اور تصویروں کی تلاش کے لئے۔ اس کے خطوط بھی ہندوستان میں اُردو اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپتے تھے۔ ان خطوط کے جواب میں جہاں مرتب کو ملک کے بعض علمی اور ادبی حلقوں سے خاصا تعاون ملا وہاں اسے بعض عتاب نامے بھی وصول ہوئے جن میں اس قسم کی عبارت درج تھی کہ آپ ہندوستان کے دشمن کی یاد میں نمائش کا انتظام کر رہے ہیں۔ اِس وقت ہندوستان میں مسلم نواز حکومت نہ ہوتی اور کوئی صحیح جمہوری حکومت ہوتی تو آپ اس وقت جیل خانے میں ہوتے ایک صاحب نے یہ لکھا کہ آپ کا نام ملک کے غداروں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ''مدر لینڈ'' نے اس نمائش کو ملک دشمن نوعیت کا کام قرار دیا اور طنزاً لکھا کہ ''اقبال نمائش'' کے مرتب اب

اس نمائش کے بعد جناح نمائش مرتب کریں گے جو ملک کے مختلف حصّوں میں منعقد کی جائے گی'' ۹

مگر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس سلسلے میں یقیناً ایک صاحب دل شخصیت ثابت ہوئے جو ان ہتک آمیز دھمکیوں سے نہ ہی مرعوب ہوئے اور نہ ہی خائف بلکہ ادبی اور علمی مشن میں خلوص دل سے آگے بڑھتے رہے۔

اسی لئے معروف اقبال شناس پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، جگن ناتھ آزاد کو یوں خراج عقیدت ادا کرتے ہیں:۔

''جگن ناتھ آزاد کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بھارت کے ابتدائی برسوں میں ناموافق حالات اور اقبال مخالف فضاء میں اقبالیات کا علم بلند کیا۔ لیکچروں، نمائشوں اور مضامین کے ذریعے اقبال کے فکر و پیغام کی وضاحت کی اور ان کی مسلسل کاوشوں سے بھارت میں اقبالیات کو فروغ ملا اور آج بھارت اور کشمیر میں اقبال شناسی ایک پختہ علمی روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ حضرات! کسی بلند و بالا عمارت کو دیکھ کر، اس کے حُسن و جمال اور خوب صورتی کو سراہتے ہوئے، یہ دیکھنا بھی قرینِ انصاف ہوگا کہ اس مستحکم عمارت کی خشت اول رکھنے والے کون لوگ تھے اور ان بنیادوں کی مضبوطی و استحکام اور ان کی استواری میں کس کس کا لہو شامل ہے''۔ ۱۰

اِسی انتھک علمی و تحقیقی جدوجہد کی وجہ سے آزاد صاحب کو چھیاسی بین الاقوامی اعزازات و اکرامات سے نوازا گیا۔ پاکستان میں انھیں اقبال میڈل عطا کیا گیا۔ برطانیہ کی بریڈفورڈ فاونڈیشن نے انھیں سیرتِ سرورِ عالمؐ کے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہندوستان و پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے بیسیوں ریسرچ اسکالروں نے اقبالیات اور اُن کی شاعری کے حوالے سے آپ پر ایم۔ فل۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کے کم از کم گیارہ تحقیقی مقالات سپرد قلم کئے۔ مذکورہ مقالوں میں بیشتر مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان مقالوں کے علاوہ بھی الگ سے کئی رسالوں کے گوشے اُن کی متنوع شخصیت پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند نام اس طرح ہیں:۔

اقبالیات آزاد از پروفیسر اسد اللہ وانی ۱۹۹۹ء جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری از حمیدہ سلطان ۱۹۶۴ء، جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ از محمد ایوب واقف جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات از خلیق انجم ۱۹۹۳ء، ارمغان آزاد از ڈاکٹر ظہور الدین ۱۹۹۳ء جگن ناتھ آزاد اور ادبی خدمات از حبیب احمد خان ۱۹۹۳ء، جگن ناتھ آزاد میری نظر میں از نذیر فتح پوری، جگن ناتھ آزاد کا فکر و فن از محمد منظور عالم، سہ ماہی لمحے لمحے، بدایوں کا ضخیم جگن ناتھ آزاد نمبر، ہندی میں جگن ناتھ آزاد نمبر از پرکاش پنڈت ۱۹۶۷ء۔

آزاد ہی نے دراصل اقبالیات کے فروغ کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیر'' قائم کرنے کے

لئے تگ ودو کا آغاز کیا تھا۔ جو چیر بعد میں باضابطہ طور پر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے نام سے برصغیر میں اپنا ایک اعلیٰ مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے جسے اب اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اُس وقت کے جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کو خط لکھا اور اُن سے ملاقاتیں کیں اور اُن کے سامنے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیر قائم کرنے کی تجویز رکھی، جسے انھوں نے قبول کیا اور اس طرح برصغیر میں پہلی دفعہ کشمیر یونیورسٹی میں ہی ''اقبال چیر'' کا وجود عمل میں آیا ۱۱

تحقیقی، علمی اور ادبی تصانیف کے علاوہ آزاد نے مضامین اور توسیعی لیکچروں کے ذریعے اقبالیات کو تمام دنیا میں فروغ عام بخشنے کے لئے اپنی مقدور بھر خدمات انجام دے دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بارہا امریکا، کینیڈا، روس، برطانیہ، متحدہ عرب امارات، جرمنی، ناروے، اسپین اور پاکستان کے اسفار کئے اور وہاں اپنے خطبات دیئے۔ انھی خصوصیات کے پیش نظر جگن ناتھ آزاد کو ''ماہرِ اقبالیات'' کا لقب دیا جاتا ہے لیکن آزاد صاحب کی کسر نفسی کے ساتھ ساتھ اُن کی علمی عظمت کا اندازہ اُن کے اس کلام سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔

''بڑی صفائی سے اور بغیر کسی تصنع کے یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس اعزاز کا ہرگز مستحق نہیں سمجھتا۔ ماہر اقبالیات کہلانے کے لئے پہلے اتنا علم تو کسی شاعر کے پاس ہو، جو اقبال کے پاس تھا۔ اقبال علم، ادب، تاریخ، فلسفہ، عمرانیات اور اسلامیات کا ایک سمندر تھے اور فارسی اور انگریزی ادب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ مجھے یہ سب کہاں حاصل ہے۔ اقبال کے علم وفضل کے مقابلے میں میرا علم 'صفر' سے بھی کم ہے۔ اقبال اگر ایک سمندر ہے تو میں ایک قطرہ بھی نہیں ہوں۔ ہاں یہ بات میرے لئے مسرت کا باعث ہے کہ اقبال پر میرے چھوٹے موٹے کام کو دنیا کے مختلف اہل قلم نے مشرق ومغرب کی بعض یونیورسٹیوں اور علمی اداروں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اقبال کے فکر وفن کے سمندر میں سے دُرِ آب دار نکال کر لاؤں، جو ابھی تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ مجھے اس فن میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، یہ دیکھنا میرے نقادوں کا کام ہے۔ اقبال کے فکر وفن کے بحر ذخار کے ساحل پر بیٹھ کر میں زیادہ تر خزف چینی کر رہا ہوں اور اس کو میں اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔ ۱۲

علامہ اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی کے ایک سابق علم دوست اسسٹنٹ لائبریرین جناب عبداللہ خاور جن کے آزاد صاحب سے نہایت قریبی تعلقات رہے ہیں کے مطابق انھوں نے (یعنی آزاد نے) اپنی

زندگی ہی میں اپنا ذاتی کتب خانہ جو قریب قریب تیس ہزار نادر کتب و رسائل پر مشتمل تھا کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری کو وقف کرنے کا اعلان کیا تھا اور اس سلسلے میں عملی اقدام بھی اُٹھائے۔ پہلے پہل انھوں نے ساڑھے گیارہ ہزار کُتب و رسائل یہاں بھیج دئے۔ علامہ اقبال لائبریری میں انھیں ''تلوک چند محروم کلیکشن'' کے نام سے محفوظ کیا گیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے اُس وقت کے اور موجودہ سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالواحد قریشی صاحب نے اقبالیات پر نمایاں خدمات انجام دینے کے علاوہ آزاد کا یہ ایثار دیکھ کر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی میں یونیورسٹی کی طرف سے ایک جگن ناتھ آزاد گولڈ میڈل رکھا، جو ہر سال اقبالیات پر بہترین تحقیقی کام کرنے پر محققین کو عطا کیا جائے گا۔ چنانچہ سال ۲۰۰۹ء میں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے منعقدہ کنوکیشن میں انسٹی ٹیوٹ میں Ph.D اقبالیات میں تین بہترین کارکردگی دکھانے والے محققین کو باضابطہ طور پر اس جگن ناتھ آزاد گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ان گولڈ میڈل یافتہ اسکالرز کے اسمائے گرامی یوں ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ۔ (آئی۔اے ایس) آفیسر جموں و کشمیر

۲۔ ڈاکٹر شہناز اقبال قریشی (اسلامک یونیورسٹی آف سائینس اینڈ ٹیکنالوجی اونتی پورہ)

۳۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی (لیکچرر جموں و کشمیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ)

دراصل جگن ناتھ آزاد ایک وسیع المشرب، ملنسار، وضعدار، ہنس مکھ، انسانیت نواز اور گنگا جمنی تہذیب کے سچے علم بردار تھے۔ آپ کی چھیاسی سالہ زندگی یقیناً علم و ادب سے پوری طرح مزین رہی۔ تعصب، تنگ نظری، بددیانتی، حسد، جلن اور سازشی ذہنیت وغیرہ عیوب سے آپ یکسر مبرا تھے۔ اسی لئے میرے نزدیک وہ علامہ اقبال کے اس شعر کے عملی مصداق ہیں ؎

کافر بیدار دل پیش صنم
بہ زِ دیندار کہ خفت اندر حرم

حواشی

۱۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء میں عیسیٰ خیل میاں والی پنجاب پاکستان میں پیدا ہوئے۔ آپ معروف اردو شاعر اور علامہ اقبال کے ہمعصر تلوک چند محروم کے بیٹے تھے۔ آپ کے جلیل القدر اساتذہ میں سید عابد علی عابد، پروفیسر علم الدین سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے خونِ آشام میں آزاد صاحب کو بھی انتہائی قلق کے ساتھ لاہور کی گلیوں کو خیر باد کہہ کر دلی کی طرف ہجرت کرنا پڑی ورنہ آزاد اُس وقت پاکستان میں ہی مستقلاً بود و باش اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پاکستان کا پہلا قومی نغمہ آپ ہی نے رقم کیا ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اعلان آزادی کے ساتھ ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا۔ اُس کا مکھڑا یہ تھا۔

ذرّے تیرے ہیں آج ستاروں سے تابناک

اے سرزمین پاک

۲۵ جولائی بروز اتوار ۲۰۰۴ء کی شام کو یہ عظیم نابغہ اس دنیا سے رخصت کر گئے۔ راقم الحروف ۱۹۹۸ء نومبر سے اُن کے ساتھ مسلسل خط و کتابت اور اُن کے کشمیر وارد ہونے پر اُن سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا کئی بار شرف حاصل کر چکا ہے۔ آپ ایم۔ فل کے سلسلے میں میرے ممتحن رہے ہیں اور آپ ہی نے میری پہلی تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مُسلم اعلام'' کا شاندار پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ آپ ایک عظیم دانشور، ماہر اقبالیات اور با اخلاق انسان تھے۔

۲۔ جگن ناتھ آزاد ''اقبال اور اُس کا عہد۔ ص ۲۵۔ ادارہ انیس الہ آباد۔ ۱۹۶۶ء۔

۳۔ ملاحظہ ہو اقبال کے مذکورہ کتاب کا پچھلا صفحہ۔

۴۔ جگن ناتھ آزاد اقبال اور مغربی مفکرین، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۴ء۔ ص (حرف اوّل طباعت اوّل)

۵۔ ملاحظہ ہو، آزاد کی کتاب ''اقبال اور اس کا عہد'' کا پچھلا صفحہ۔

۶۔ حرفِ اقبال۔ ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۲۳ (مشمولہ) اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۷۲۔

۷۔ اقبال اور مغربی مفکرین۔ص ۷۹ (فٹ نوٹ)

۸۔ ایضاً، ص۔ ۹۷

۹۔ جگن ناتھ آزاد ''ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے توسیعی لیکچر'' اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ۱۹۸۹ء

۱۰۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اصل کارنامہ'' (مشمولہ) فکر آزاد (مرتب) ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، فروری ۲۰۰۶ء، ص۔ ۱۴۔

۱۱۔ روزنامہ جنگ کراچی ۲۸ مارچ ۱۹۸۶ء۔ (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد بطورِ اقبال شناس از یاسمین کوثر ص ۱۲۰، اردو فورم پبلشرز، جموں توی ۲۰۰۲ء

۱۲۔ ''العطش'' ص ۵۸ (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس از یاسمین کوثر، ص ۱۲۴ اردو فورم پبلشرز جموں توی ۲۰۰۲ء

جموں وکشمیر میں اقبال شناسی.....مسائل، امکانات اور خدمات

ڈاکٹر ریاض توحیدی

کشمیر کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں علامہ اقبال کی بلند قامت شخصیت نمایاں مقام کی حامل ہے۔انہوں نے نہ صرف گلشن کشمیر کے دل فریب نظاروں، فلک بوس کہساروں، ترنم ریز آبشاروں اور حسین وجمیل مرغزاروں کے دلکش حُسن کی منظر کشی کرتے ہوئے ؎

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب

اے وادیٔ لولاب

جیسے متعدد اشعار اور نظمیں لکھ کر جنتِ کشمیر کی حسین فضاؤں کو خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ کشمیر ان کی روح کی گہرائیوں میں آباد رہا ہے۔یاد رہے کہ کشمیر صدیوں سے محکومی، پسماندگی اور بے چارگی کا ہدف رہا ہے۔یہ فرزندِ کشمیر علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے کشمیر کے درد کو شدت سے محسوس کیا اور ایک مخلص رہنما کی حیثیت سے، کشمیریوں کی سیاسی محکومی، معاشی بدحالی اور نفسیاتی دباؤ کی داستانِ الم اقوام عالم کے حریت پسند ایوانوں تک پہنچانے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔تحریک حریت کشمیر سے علامہ اقبال کی فکری و عملی وابستگی کے تعلق سے کلیم اختر اپنے ایک مضمون ''اقبال اور آزادیٔ کشمیر'' میں لکھتے ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ علامہ تازیست تحریک حریت کشمیر سے فکری و عملی طور پر وابستہ رہے اور زندگی کے کسی دور میں بھی اس سے لاتعلق یا بیگانہ نہیں ہوئے''۔

چنانچہ علامہ اقبال کشمیریوں کی طویل غلامی کے خاتمے کی دُعا کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں فرماتے ہیں۔

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا

بَن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا

توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے

روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں جب جموں وکشمیر میں اقبال شناسی کی خدمات کا سوال ذہن میں آتا ہے تو ان خدمات کی بہت سی جہتیں نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ جس طرح علامہ اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں کے ساتھ قلبی اُنس تھا اُسی طرح کشمیری بھی اپنے اُس مُخلص رہنما کی احسان مندی کا اعتراف مختلف زاویوں سے کرتے آئے ہیں، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کشمیر کے پیر و جواں کے ذہنوں پر علامہ کا نام و پیام کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔

جہاں تک جموں وکشمیر میں اقبال شناسی کی خدمات کا تعلق ہے اس سلسلے میں حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی میں اُردو میں جو پہلی کتاب کلامِ اقبال پر تحریر ہوئی تھی میری معلومات کے مطابق وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے مولوی احمد الدین کی کتاب ''اقبال پر ایک نظر'' ہے ۱۹۲۶ء میں اس کتاب کے شائع ہونے سے کتابی صورت میں اقبال شناسی کی روایت کی بنیاد پڑ گئی۔

جموں وکشمیر میں اقبال شناسی کی خدمات میں جن شاعروں، مفکروں، عالموں، دانشوروں، محققوں اور مورخین و ناقدین نے علامہ اقبال کے فکر و فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ان میں منشی محمد الدین فوق، مہجور کاشمیری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، جناب کلیم اختر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب سید علی شاہ گیلانی، پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب حکیم منظور، پروفیسر غلام رسول ملک، جناب غلام نبی خیال، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر محمد اسد اللہ وانی، ڈاکٹر بدر الدین بٹ، پروفیسر سید حبیب، جناب عبداللہ خاور، ڈاکٹر نذیر احمد شیخ، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اور ڈاکٹر نذیر احمد (دوردرشن کیندر سرینگر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جن مفکروں اور ناقدوں نے ملازمت کے سلسلے میں کشمیر میں اقامت کے دوران اقبال شناسی میں حاظر خواہ اضافہ کیا ان میں پروفیسر آلِ احمد سرور، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر سیّد سراج الدین، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر مسعود حُسین خان، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قدوس جاوید وغیرہ کی خدمات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مندرجہ بالا اقبال شناسوں نے اقبال اور اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل کام کیا ہے اور علامہ کی دانشوری، تخلیقیت، شخصیت، بصیرت، فکر و نظر، تنقیدی شعور اور سیاسی آگاہی جیسے پہلوؤں پر بصیرت افروز

مقالات اور کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں پر میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہنا چاہونگا کہ اقبالؔ شناسی کی تاریخ میں علامہ کی شخصیت اور فکر وفن پر جو کام کشمیر میں ہوا ہے وہ اقبالؔ کے تئیں بہترین خراج عقیدت کے مترادف ہے۔ پچھلی ایک دہائی میں اقبالیات کے حوالے سے کشمیر میں جو کتابیں سامنے آئی ہیں میرے خیال میں ان میں دو کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں ایک پروفیسر حامدی کاشمیری کی کتاب ''اقبال کا تخلیقی شعور'' اور دوسری پروفیسر قدوس جاوید کی کتاب ''اقبال کی تخلیقیت'' ہے۔ تنقیدی نوعیت کی یہ دونوں کتابیں اقبالؔ کے فکر وفن کو جدید تنقیدی زاویے سے پرکھنے کے عمل کو پیش کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کئی امور میں اختلاف ہونے کے باوجود یہ کتابیں مطالعۂ اقبالؔ کے تعلق سے نئے امکانات کی نشان دہی بھی کرتی ہیں اور اقبالیات کے دانشوروں اور ناقدوں کو دعوت فکر بھی دے رہی ہیں۔

کشمیر میں اقبالؔ فہمی اور اقبالؔ شناسی کو فروغ دینے میں کچھ اداروں کا رول بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان میں جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، اقبالؔ اکادمی کشمیر اور اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر یونیورسٹی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی وہ واحد ادارہ ہے جو اقبالؔ فہمی اور اقبالؔ شناسی کے میدان میں تحقیقی وتنقیدی، تالیفی وتصنیفی اور تقریری وتدریسی سطح پر تاریخی کردار ادا کر رہا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر حامدی کاشمیری ''اقبالؔ کا تخلیقی شعور'' میں اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ بلاشبہ اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ نے اقبالؔ فہمی میں ایک اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ کے کلام و پیام کو عام قاری تک پہنچانے میں کشمیر سے شائع ہو رہے اخبارات اور رسائل کی خدمات بھی قابل داد ہیں۔ اس تعلق سے اخبارات میں آفتاب، سرینگر ٹائمز، کشمیر عظمیٰ، گریٹر کشمیر، قومی وقار، مومن اور رسائل میں اقبالیات، بازیافت، شیرازہ، حکیم الامت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں دوردرشن کیندر سرینگر اور ریڈیو کشمیر سرینگر کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ محکمۂ تعلیم جموں وکشمیر کا یہ قدم بھی قابل ستائش ہے کہ پچھلے چند برسوں سے یہ محکمہ ریاستی سطح پر تعلیمی اداروں میں یومِ اقبالؔ کی تقریب منعقد کرا رہا ہے۔ تاہم سرکاری سطح پر ہائر اسکینڈری سے لیکر کالج کی سطح کے نصاب میں کلامِ اقبالؔ کو ترجیحی بنیادوں پر شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان اداروں میں زیر تعلیم طالب علم بھی صحیح معنوں میں اقبالؔ کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی وادبی افکار سے روشناس ہو سکیں۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد آخر پر میں اس حقیقت کا اظہار کرنا مفید سمجھتا ہوں کہ کشمیر کی نئی نسل جس جوش وجذبے کے ساتھ اقبالیاتی سمیناروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے اور اس میں کلامِ اقبالؔ کو پڑھنے، سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا جو رجحان نظر آرہا ہے وہ اقبالؔ شناسی کے روشن تر امکانات کا جواز فراہم کرتے ہوئے علامہ کے اس مشہور شعر کی معنوی عکاسی کر رہا ہے کہ۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کِشتِ ویران سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی.....ایک جائزہ

ڈاکٹر عرفان احمد ملک

کشمیر اور اہالیانِ کشمیر کی علامہ اقبال سے عقیدت و محبت ایک مُسلمہ حقیقت ہے کیونکہ ایک تو وہ کشمیر الاصل تھے اور ان کے آباواجداد یہاں سے ہجرت کر کے سیالکوٹ (پنجاب) میں بس گئے تھے، بقولِ اقبال کے ہی یہ ''برہمن زادہ رمز آشنائے رُوم و تبریز'' تھا۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی اس بابت رقمطراز ہیں۔

''شیخ محمد اقبال کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کی ایک شاخ اَب تک کشمیر میں موجود ہے۔ یوں تو برہمن ہندوستان میں اپنے مذہبی تقدس کی وجہ سے عموماً معزز سمجھے جاتے ہیں، لیکن کشمیری برہمن کشمیر میں علمی حیثیت سے بھی خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اگرچہ اسلام کے زیرِ اثر اقبال ذات پات اور نسل کے افتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، تاہم جابجا اِن کے اشعار میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ ان کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقبال کے آباواجداد کشمیر سے جا کر پنجاب میں بس گئے تھے''۔

(ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، اقبال کا ماحول اور شخصیت، تلمیحاتِ واشاراتِ اقبال، ص۔۳)

اور دوسرے انہیں کشمیر اور کشمیریوں سے کافی محبت، عقیدت اور ہمدردی تھی جس کا برجستہ اظہار انہوں نے واشگاف الفاظ میں نثر و نظم میں کئی جگہ کیا ہے۔ وہ کشمیریوں پر ہو رہے ظلم سے کافی پریشان تھے، جہاں وہ کشمیریوں کی آزادی کے لئے مضطرب رہتے تھے۔ وہیں وہ کشمیریوں کی اقتصادی زبوں حالی سے بھی کافی دل برداشتہ تھے۔ بقول اقبالؒ

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے کب مرعوبِ سلطان و امیر

کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ!
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

(ارمغانِ حجاز [اردو]، کلیاتِ اقبال، ص ۶۸۹)

اقبال کشمیریوں کی جدوجہد کی حمایت میں کوشاں تھے اور کشمیریوں کی آزادی کے لئے سرگرم بھی تھے۔ وہ کشمیر کے قدرتی جمال پر فریفتہ تھے اور اس خطۂ حُسن میں بسنے والے کشمیریوں کی زبوں حالی اور بے بسی پر پشیمان بھی تھے، جس کا اعتراف اُنہوں نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے، یوں اقبال کشمیریوں کے محبوب بن گئے اور بقول جگن ناتھ آزاد ''اقبال کا ذکر اہل کشمیر کے لئے ذکرِ محبوب کی حیثیت رکھتا ہے''۔

اقبال اور کشمیر کی اس قدر ایک دوسرے سے عقیدت و محبت کی وجہ سے ہی اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے جامعہ کشمیر میں اقبالیات کے لئے ایک ادارہ کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح ۱۹۷۷ء میں جامعہ کشمیر میں ''مسندِ اقبال'' قائم ہوئی اور ٹھیک دو سال بعد یعنی ۲۱ مئی ۱۹۷۹ء میں اسے وسعت دے کر ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' کی شکل دے دی گئی اور ۲۰۰۸ء میں اس ادارے کا نام ''اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی'' رکھا گیا، جس کا مقصد ادارے کو مزید فعال اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی پرواز کو مغربی دنیا تک وسعت دینا تھا۔ جہاں اقبال کو حکیمِ مشرق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کا مقصد اقبالیات پر تحقیق و تنقید کے علاوہ سیمناروں، مشاعروں اور مذاکروں کے ذریعے لوگوں تک فکرِ اقبال پہنچانا ہے۔ ہمیں اِس ادارے پر جتنا فخر ہو کم ہے، اِس بابت مشہور ماہر اقبالیات پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''برعظیم میں اقبالیات کے متعدد مراکز کام کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ لاہور کے بعد سرینگر مطالعۂ اقبال کا سب سے بڑا مرکز ہے''

(پروفیسر تسکینہ فاضل، اقبال اور مطالعاتِ اقبال، ص ۱)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اِسی دیباچہ میں آگے چل کر اِس بارے میں سرینگر (کشمیر) کو لاہور (پاکستان) پر فوقیت ہونے کا برجستہ اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہاں اس امر کا اعتراف بھی مناسب ہوگا کہ اقبال چیئر کے قیام کے سلسلے میں سرینگر کو لاہور پر ایک واضح فوقیت حاصل ہے۔ جیسا کہ میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں کہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں جب پروفیسر آل احمد سرور اور جگن ناتھ آزاد لاہور کی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک تھے، یہ معلوم ہونے پر کہ پنجاب یونیورسٹی میں ابھی تک اقبال چیئر قائم نہیں ہو سکی، جگن ناتھ آزاد نے اُس وقت کے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا: کشمیر یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی پر بازی لے گئی ہے اور جنرل صاحب نے اس بات کو تسلیم کیا۔ پھر اسی واقعہ سے تحریک پا کر پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۷۹ء میں اپنے ہاں اقبال چیئر قائم کی مگر یہ ابھی تک اقبال چیئر ہی ہے جب کہ سرینگر کی اقبال چیئر ایک انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہو کر اقبالیات کا ایک تحقیقی ادارہ بن چکا ہے''۔

(پروفیسر تسکینہ فاضل، اقبال اور مطالعاتِ اقبال، ص ۱)

یہ ادارہ اردو کی خدمت میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ اس ادارے کا تقریباً ۹۹ فیصد کام اردو زبان میں ہی ہوتا ہے۔ اس ادارے نے اب تک تقریباً تیس (۳۰) قومی اور بین الاقوامی سیمناروں کے علاوہ متعدد توسیعی خطبے منعقد کیے ہیں۔ جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	موضوع	تاریخ
۰۱۔	اقبال اور تصوف (سہ روزہ سیمینار)	اکتوبر ۱۹۷۷ء
۰۲۔	اقبال اور مغرب (سہ روزہ سیمینار)	۳۔۱۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء
۰۳۔	احیائے اسلام (سہ روزہ سیمینار)	جولائی ۱۹۷۹ء
۰۴۔	اقبال.....شاعر اور شخصیت	۱۹۷۹
۰۵۔	فانی بدایونی.....فن اور شخصیت	۱۹۸۰
۰۶۔	حسرت موہانی	۱۹۸۰

۰۷۔	جدید دور اور اقبال	۱۹۸۱ء
۰۸۔	جدید دور میں اسلام: مسائل اور امکانات (پانچ روزہ سمینار)	۳ تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء
۰۹۔	ہندوستان میں تصوف (سہ روزہ سمینار)	۱۹۸۳ء
۱۰۔	اقبال اور اردو نظم	۱۹۸۴ء
۱۱۔	اردو شعریات (یک روزہ سمینار)	۱۹۸۴ء
۱۲۔	اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام	مئی ۱۹۸۶
۱۳۔	اقبال کی فارسی شاعری	۱۹۸۹ء
۱۴۔	اقبال.....خطبات اور شاعری (دو روزہ سمینار)	۱۹۹۰ء
۱۵۔	اقبال اور قرآن	۱۹۹۲ء
۱۶۔	اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (۲ نشستیں)	۱۹۹۵ اور ۱۹۹۶
۱۷۔	اقبال کا فن	۱۹۹۷ء
۱۸۔	وہ دانائے سُبُل ختم الرسلؐ	۱۹۹۹ء
۱۹۔	اقبال اور معاصر نظامِ تعلیم	اکتوبر ۲۰۰۰ء
۲۰	اقبالیات کے گذشتہ دس سال	ستمبر ۲۰۰۳ء
۲۱۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد سمینار	۱۳ تا ۱۵ جولائی ۲۰۰۳ء
۲۲۔	پروفیسر قاضی غلام محمد.....شخصیت اور شاعری	جولائی ۲۰۰۰ء
۲۳۔	حکیم منظور.....شاعر اور شخصیت	۲۹ تا ۳۱ جولائی ۲۰۰۷ء
۲۴۔	ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب (قرآنی مجلس)	۱۴ اکتوبر ۲۰۰۶ء
۲۵۔	حسینی مشاعرہ	۱۰ فروری ۲۰۰۷ء
۲۶۔	سیرت النبیؐ کانفرنس	۱۴ اپریل ۲۰۰۷ء
۲۷۔	قرآنی مجلس	۱۴ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۲۸۔	اقبال بارگاہِ رسالتؐ میں	۱۵ مارچ ۲۰۰۸ء

۲۹۔ اقبال کا تصورِ انقلاب ۱۸ مارچ ۲۰۰۹ء

۳۰۔ اقبال کے نظامِ فکر پر قرآن کے اثرات اکتوبر ۲۰۰۹ء

۳۱۔ اقبال کا نظامِ فکر اور آنحضورؐ کا مرتبہ و مقام ۱۱ مارچ ۲۰۱۰ء

۳۲۔ واقعۂ کربلا اور اقبال کی شاعری ۱۴ دسمبر ۲۰۱۰ء

۳۳۔ انسانی دنیا پر رسول اللہؐ کے احسانات ۱۷ مارچ ۲۰۱۱ء

۳۴۔ جموں و کشمیر میں اقبال شناسی ۲۱ تا ۲۳ اپریل ۲۰۱۱ء

درج بالا سمیناروں اور کانفرنسوں کے ساتھ ساتھ ادارہ ہر سال ۹ نومبر اور ۲۱ اپریل کو اقبال کے یومِ پیدائش اور یومِ وصال پر باقاعدگی کے ساتھ سمینار کرنے کے علاوہ سیرت النبیؐ پر ایک بڑا ''سالانہ سیرتی اجتماع'' بھی پابندی کے ساتھ منعقد کرتا ہے۔ اس جلسے میں لوگ بڑے ذوق و شوق سے آتے ہیں، کیونکہ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد مجلس ہوتی ہے، جس میں ہر مکتبۂ فکر سے وابستہ لوگ اور علماء شرکت کرتے ہیں۔

چونکہ یہ ایک تحقیقی ادارہ ہے اسلئے توسیعی خطبے تحقیق کی جان ہوتے ہیں۔ سمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپوں کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ محققین کے لئے توسیعی خطبوں کا بھی وقتاً فوقتاً اہتمام کرتا آیا ہے۔ ان خطبوں میں برصغیر کے معتبر اساتذہ نے جہاں شرکت کی ہے، وہیں ان خطبوں میں نامور مستشرقین نے بھی حصہ لیا ہے۔ ان توسیعی خطبوں کی فہرست اس طرح سے ہے۔

نمبر شمار	مقرر	متعلق	موضوع
۱۔	پروفیسر ایس گھوش	شانتی نیکیتن (مغربی بنگال)	اروندو اور اقبال
۲۔	پروفیسر دیا کرشن	راجستھان یونیورسٹی	شاعری اور فلسفہ
۳۔	خشونت سنگھ	ناول نگار	The problem of translating Iqbal into English
۴۔	اے۔ ٹی۔ ایمبری	کولمبیا یونیورسٹی	Modernization and westernization
۵۔	عالم خوندمیری	عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	
۶۔	پروفیسر سید وحید الدین	دہلی یونیورسٹی	

۷۔	پروفیسر سید حامد	علی گڈھ مسلم یونیورسٹی	اقبال کی فارسی شاعری
۸۔	انا میری شمل	ہاورڈ یونیورسٹی	Iqbal & Goethe, Iqbal & Rumi, Iqbal & Mansoor-i-Halaj
۹۔	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	ندوۃ العلما	عصر حاضر میں اسلام کی معنویت
۱۰۔	پروفیسر مشیر الحسن	جامعہ ملیہ اسلامیہ	Islam & Nationalism with sepacial role to the nationalist muslims
۱۱۔	پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی	علی گڈھ مسلم یونیورسٹی	اقبال اور خطباتِ اقبالؒ
۱۲۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	جموں یونیورسٹی	اقبال اور مستشرقین
۱۳۔	پروفیسر مسعود حسین خان		ادب کے مطالعہ میں لسانیات کی اہمیت
۱۴۔	پروفیسر عبدالرشید نازکی	کشمیر یونیورسٹی (شعبۂ کشمیری)	اقبال کی نظم
۱۵۔	پروفیسر آغا اشرف علی	ماہر تعلیم جموں و کشمیر	
۱۶۔	پروفیسر عبدالمغنی	رائیس جامعہ (میتھلا یونیورسٹی)	اقبالؒ اور مغرب
۱۷۔	محترمہ ادریسہ پنڈت	یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ	Response of the west to Iqbal
۱۸۔	ڈاکٹر مشتاق احمد	مدیر سہ ماہی ''جہان اردو'' (دربھنگہ)	ہندوستان میں اقبالیات
۱۹۔	پروفیسر اخلاق اثر	ماہر تعلیم و صحافی (بھوپال)	اقبالؒ اور بھوپال
۲۰۔	پروفیسر عبدالحق	دہلی یونیورسٹی	اقبال اور انسانیت

اَب تک اس ادارے کی تقریباً ۸۰ کے قریب کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں اردو کی ۵۴، انگریزی

کی ۱۲ اور ہندی کی ایک کتاب شامل ہے۔ ادارے کی مطبوعات کی فہرست درج ذیل ہے۔

اقبال کی عملی اور نظری شعریات	پروفیسر مسعود حسین خان
اقبال اور مغرب	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
اقبال کے مطالعے کے تناظرات	پروفیسر آل احمد سرور
اقبال اور اُردو نظم	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
اقبال اور غزل	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
اقبال اور مغربی فکر	پروفیسر وحید الدین
اقبال اور تصوف	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
اُردو شعریات	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
جدیدیت اور اقبال	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
تفکر اقبال	سید وحید الدین
ہندوستان میں تصوف	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
خطباتِ اقبال پر ایک نظر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
ہماری تعلیمی صورت حال	پروفیسر آل احمد سرور
حکمت گوئٹے اور فکرِ اقبال	پروفیسر وحید الدین
تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
جدید دنیا میں اسلام	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
محمد اقبال۔ میر سید میر شکر	مترجم: کبیر احمد جائیسی
علامہ اقبال (مصلح قرنِ آخر)	مترجم: کبیر احمد جائیسی
ہندوستان میں اقبالیات	پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اقبال کی فارسی شاعری	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
اقبال۔ خطبات اور شاعری	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی

سرودِ سحر آفرین	پروفیسر غلام رسول ملک
اقبال اور قرآن	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
اقبال کا ودرشن (ہندی)	مترجم: ڈاکٹر چمن لال رینہ
مفتاحِ اقبال	مرتبہ: عبداللہ خاور
اقبال اور مابعد التاریخ	ڈاکٹر حیات عامر حسینی
اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
اقبال کا فن	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
مطبوعاتِ اقبال انسٹی ٹیوٹ	مرتبہ: عبداللہ خاور
ایک توضیحی اشاریہ	
اقبال کی جمالیات	ڈاکٹر قدوس جاوید
اقبال۔ایک تذکرہ	حکیم منظور
اقبال۔ایک تجزیہ	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
مطالعۂ مثنوی اسرارِ خودی	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
تشکیل جدید الٰہیات کے مسلم اعلام	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی
وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
نفحاتِ اقبال	مرتبہ: ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
اقبال کا تخلیقی شعور	پروفیسر حامدی کاشمیری
خطبات اقبال کا تنقیدی مطالعہ (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)	ڈاکٹر حمید نسیم رفیع آبادی
دوآبہ	مجاز جے پوری
اقبالیات۔گزشتہ دس سال	مرتبہ: پروفیسر بشیر احمد نحوی
اقبال کی تجلیات	مرتبہ: پروفیسر بشیر احمد نحوی

رازِ الوند	پروفیسر سید حبیب
مفتاحِ اقبال (جلد دوم)	مرتبہ: عبداللہ خاور
تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال	ڈاکٹر مُعید الظفر
فکرِ آزاد	مرتبہ: پروفیسر بشیر احمد نحوی
اقبال بحرِ خیال	مرتبہ: پروفیسر بشیر احمد نحوی
جاوید نامہ (منظوم اردو ترجمہ)	پروفیسر سید سراج الدین
اقبال اور عالم عربی	ڈاکٹر بدر الدین بٹ
اقبال کی تخلیقیت	پروفیسر قدوس جاوید
جامعہ کشمیر اور اقبالیات	ڈاکٹر بدر الدین بٹ
نقد الشعر	ڈاکٹر محمد ظفر
اقبال اور سوشلزم	ڈاکٹر نذیر احمد شیخ
لالہ طُور	سلطان الحق شہیدی
عبدالوہاب عزام	دلزُبا بشیر

ENGLISH PUBLICATIONS

1. Islam in the Modern World (Problems and Prospects)	Prof. A. A. Saroor
2. Islamic Resurgence	Prof. A. A. Saroor
3. Some Aspects of Iqbal's Poetic Philosophy	Prof. Alam Khundmiri
4. Modernity and Iqbal	Prof. A. A. Saroor
5. Islam in India: Since Independence	Prof. M. A. Andrabi

6. Iqbal and Indian Heritage — Dr. C.L.Raina
7. Tagore, Sri Aurobindo and Iqbal — Sisar Kumar Ghosh
8. Iqbal's Raptures Melodize Education — Prof. Syed Habib
9. Iqbal's Multiformity — Edited by Dr. B. A. Nahvi
10. Iqbal's Idea of Self — Edited by Dr. B. A. Nahvi
11. Iqbal's Religio-Philosophical Ideas — Edited by Prof.B.A. Nahvi
12. Al-Ghazali & Iqbal (their perspective on education) — Dr Tariq Masoodi

اِن مطبوعات کے علاوہ، شعبۂ اقبالیات ہر سال باقاعدگی کے ساتھ سالانہ مجلّہ ''اقبالیات'' بھی شائع کرتا ہے، جو کہ اردو ادب اور اقبالیات کے حلقوں میں اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے، اس مجلّے میں ماہرین اقبالیات کے ساتھ ساتھ ابھرتے محققوں کی معیاری نگارشات کو بھی جگہ دے کر نئی نسل میں فکر اقبال کو شعوری طور پر پہنچایا جاتا ہے. اب تک اس مجلّے کے بیس (۲۰) شمارے سامنے آ چکے ہیں۔

اس ادارے کا مقصد جہاں سمیناروں، کانفرنسوں، مذاکروں، مطبوعات وغیرہ کے ذریعے پیام اقبال کو فروغ دینا ہے، وہیں اس ادارے کا اہم مقصد اقبالیات پر باضابطہ تحقیق یعنی ایم۔فل (M.Phil) اور پی ایچ۔ڈی (Ph.D) کے پروگراموں کا انعقاد بھی شامل ہے، یہاں تک کہ طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ ادارہ وظیفہ کے علاوہ بہترین مقالہ لکھنے والوں کو ''طلائی تمغہ'' (Gold Medal) دینے کا بھی وعدہ بند ہے۔ اس ادارے نے اب تک ۱۳۵ ایم۔فل اور ۲۰ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں اسکالروں کو تفویض کی ہیں۔ جو اس طرح سے ہیں۔

نمبر شمار	محقق کا نام	ڈگری	موضوع	زیرِ نگراں
۱۔	محترمہ زاہدہ پروین	ایم۔فل	اقبال کی شاعری پر غالب کے اثرات	آل احمد سرور
۲۔	محترمہ زرینہ بٹ	ایم۔فل	اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی جائزہ	آل احمد سرور

۳۔	محترمہ طالعہ افروز	ایم۔فل	اقبال اور فنون لطیفہ	آل احمد سرور
۴۔	جناب محمد امین اندرابی	پی۔ایچ۔ڈی	مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ	آل احمد سرور
۵۔	محترمہ تسکینہ فاضل	پی ایچ۔ڈی	فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر	آل احمد سرور
۶۔	محترمہ نصرت اندرابی	پی ایچ۔ڈی	حالی، اکبر اور اقبال کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	آل احمد سرور
۷۔	محترمہ فریدہ کول	پی ایچ۔ڈی	اقبال اور کشمیر	آل احمد سرور
۸۔	محترمہ شفیقہ ڈار	پی ایچ۔ڈی	اقبال اور ہیومنزم	آل احمد سرور
۹۔	جناب سی۔ایل۔رینا	پی ایچ۔ڈی	شری اروندو	آل احمد سرور/ آر۔کے شرما
۱۰۔	محترمہ بلقیس سراج	پی ایچ۔ڈی	اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ	پروفیسر مسعود حسین خان/ پروفیسر کبیر احمد جائسی
۱۱۔	جناب محمد امین نجار	ایم۔فل	اقبال کی نثر کا تنقیدی جائزہ	پروفیسر محمد امین اندرابی
۱۲۔	جناب مظفر احمد ٹاک	ایم۔فل	اقبال اور مجبور ایک تقابلی مطالعہ	پروفیسر محمد امین اندرابی
۱۳۔	جناب محمد شفیع سمبلی	ایم۔فل	اقبال کے اثرات کشمیری شعراء پر	پروفیسر محمد امین اندرابی/ پروفیسر اے۔آر۔راہی
۱۴۔	جناب سجاش چندر	ایم۔فل	جدید اردو شاعری اور اقبال	پروفیسر اے۔اے۔سرور
۱۵۔	جناب بشیر احمد نحوی	پی ایچ۔ڈی	اقبال اور تصوف	اے۔اے۔سرور/ ضیاالحسن فاروقی
۱۶۔	جناب نذیر احمد شیخ	پی ایچ۔ڈی	اقبال اور سوشلزم	پروفیسر اے۔اے۔سرور/ پروفیسر سلیم قدوائی
۱۷۔	جناب سید شبیر احمد	پی ایچ۔ڈی	مشاہیر پر اقبال کی اردو نظمیں کلامِ اقبال کے اعلام و مشاہیر	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۱۸۔	محترمہ تبسم	ایم۔فل	Iqbal and Kantian epistemology: A comparative study	پروفیسر محمد امین اندرابی/ جی آر ملک۔
۱۹۔	محترمہ صورت جہاں	پی ایچ۔ڈی	بانگ درا کی منظری نظمیں.....اقبال بحیثیت شاعر فطرت	پروفیسر محمد امین اندرابی
۲۰۔	جناب مشتاق احمد کنائی	ایم۔فل	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مسلم اعلام	پروفیسر محمد امین اندرابی
۲۱۔	محترمہ ہمی جان	ایم۔فل	Iqbal's cocept of God	پروفیسر محمد امین اندرابی
۲۲۔	جناب طارق احمد مسعودی	پی۔ایچ۔ڈی	Iqbal on Education: A critiçal study	پروفیسر محمد امین اندرابی

۲۳۔ جناب بشیر احمد ڈار	ایم۔فل	اقبال کی شاعری کے کشمیری تراجم: ایک جائزہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل/ ڈاکٹر شادر مضان
۲۴۔ جناب محمد شفیع کھانڈے	ایم۔فل	اقبال اور آزاد کا تصورِ آزادی	ڈاکٹر بی۔اے۔نحوی
۲۵۔ جناب سید عبدالمجید	ایم۔فل	اقبال کا فلسفہ، اسرارِ خودی کے آئینے میں: ایک جائزہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۲۶۔ جناب مشتاق احمد گنائی	پی ایچ۔ڈی	فلسفہ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۲۷۔ جناب طارق احمد مسعودی	پی ایچ۔ڈی	Al-Gazali and Iqbal :Their Perspective on Education	پروفیسر بی۔اے۔نحوی/ ڈاکٹر ایچ۔یو۔مرازی
۲۸۔ جناب محمد اعجاز اشرف	ایم۔فل	اقبال کی اردو شاعری کا اصلاحی پہلو	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۲۹۔ جناب ظفر اقبال لون	ایم۔فل	اقبال کی اردو شاعری کے اماکن.....ایک جائزہ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۳۰۔ محترمہ شہناز پروین	ایم۔فل	مکاتیب اقبال کے ادبی پہلو: ایک مطالعہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۳۱۔ محترمہ رخسانہ حسن	ایم۔فل	اقبال کی شاعری میں تصورِ اخلاق ایک مطالعہ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۳۲۔ محترمہ جہاں آرا	ایم۔فل	میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر اقبال کے اثرات۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۳۳۔ جناب شہناز اقبال قریشی	ایم۔فل	Iqbal's message to youth:An Evaluation of some selected poems	پروفیسر۔بی۔اے نحوی
۳۴۔ جناب محمد شمیم بٹ	ایم۔فل	اقبال کی فطرت شناسی بانگِ درا کے حوالے سے	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۳۵۔ جناب ریاض احمد بٹ	ایم۔فل	حامدی کشمیری کی اقبال شناسی	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۳۶۔ محترمہ مدثر ماجد	ایم۔فل	اقبال کی اردو شاعری میں پرندوں کی علامتی معنویت: ایک مطالعہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۳۷۔ جناب سید فضل اللہ	ایم۔فل	اقبال اور تصورِ ولایت	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۳۸۔ جناب عامر حمزہ شاہ	ایم۔فل	اقبال کا تصورِ انسان	پروفیسر بی۔اے۔نحوی/ پروفیسر یونس گیلانی
۳۹۔ جناب اشتیاق حسین وانی	ایم۔فل	اقبال کی شاعری میں تصورِ اہلِ بیت	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۴۰۔ جناب محمد امین شیخ	ایم۔فل	اقبال کا تعلیمی تصور.....ایک جائزہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل

۴۱۔ محترمہ نصرت	ایم۔فل	پروفیسر آلِ احمد سرور کی اقبال شناسی	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۴۲۔ جناب پیرزادہ غلام رسول	ایم۔فل	Iqbal's Concept of State	پروفیسر بی۔اے۔نحوی/ پروفیسر اے۔آر بٹ
۴۳۔ محترمہ پروینہ حبیب	ایم۔فل	پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی: ایک مطالعہ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۴۴۔ جناب احسان الحق	ایم۔فل	اقبال کی شاعری میں اولیاء و مشائخ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۴۵۔ محترمہ صفورہ بانو	ایم۔فل	پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی اقبال شناسی	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۴۶۔ جناب بشیر احمد غمگین ذوہامی	پی ایچ۔ڈی	اردو اور کشمیری شاعری پر اقبال کے اثرات: کشمیر کے حوالے سے	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۴۷۔ راقم الحروف	پی ایچ۔ڈی	اقبال اور جدید ذہن: ایک تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۴۸۔ جناب ظہور احمد مخدومی	پی ایچ۔ڈی	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی اقبال شناسی	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۴۹۔ جناب سید فضل اللہ	پی ایچ۔ڈی	اقبال کا تصورِ امامت	پروفیسر بشیر احمد نحوی
۵۰۔ جناب ریاض احمد بٹ	پی ایچ۔ڈی	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۵۱۔ محترمہ نصرت جبین	پی ایچ۔ڈی	اقبال کا تصورِ نسواں	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۵۲۔ جناب محمد شمیم بٹ	پی ایچ۔ڈی	اکبر اور اقبال کی تنقیدِ مغرب	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۵۳۔ مدثر ماجد	پی ایچ۔ڈی	کلام اقبال کی شرحیں: ایک جائزہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
۵۴۔ جناب شہناز اقبال قریشی	پی ایچ۔ڈی	Iqbal's concept of Time and Space:A Study	ڈاکٹر بی۔اے۔نحوی/ پروفیسر حمید اللہ مرازی
۵۵۔ محترمہ شبینہ شبیر	ایم۔فل	پروفیسر عبدالحق بحیثیت اقبال شناس	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۵۶۔ محترمہ دلزبا بشیر	ایم۔فل	عبدالوہاب عزام بطور اقبال شناس: ایک تحقیقی مطالعہ	پروفیسر تسکینہ فاضل
۵۷۔ جناب رئیس احمد شاہ	ایم۔فل	عرب اماکن اور شعر اقبال: ایک مطالعہ	ڈاکٹر تسکینہ فاضل/ ڈاکٹر شاد حسین
۵۸۔ جناب بشیر احمد شیخ	ایم۔فل	فقہ اسلامیہ کی تدوینِ نو خطوط اقبال کے آئینے میں	پروفیسر بی۔اے۔نحوی/ ڈاکٹر شاد حسین
۵۹۔ محترمہ بلقیس ڈار	ایم۔فل	اقبال اور ملٹن.....ایک تقابلی مطالعہ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی/ پروفیسر اے۔ایچ۔ناک
۶۰۔ جناب ریاض احمد شاہ	ایم۔فل	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اقبال شناسی بحوالہ خاص ''اقبال اور قرآن''	ڈاکٹر فرید پربتی/ڈاکٹر شاد حسین

۶۱۔ محترمہ شمس العارفین	ایم۔فل	مکاتیب اقبال کے نمائندہ مشاہیر..... ایک تحقیقی مطالعہ	پروفیسر بی۔اے۔نحوی / پروفیسر شاد حسین
۶۲۔ جناب پیر نصیر احمد	پی ایچ۔ڈی	اقبال کی شعری ونثری تصانیف میں سیاسی عناصر	پروفیسر بی۔اے۔نحوی
۶۳۔ جناب محمد یعقوب راتھر	ایم۔فل	کلام اقبال میں جوامع الکلم: ایک جائزہ	ڈاکٹر فرید پربتی
۶۴۔ جناب فیاض احمد وانی	ایم۔فل	فکرِ اقبال میں تصورِ توحید کی اہمیت	پروفیسر تسکینہ فاضل / ڈاکٹر شاد حسین
۶۵۔ محترمہ مزمل جان	ایم۔فل	ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت اقبال شناس: ایک جائزہ	پروفیسر تسکینہ فاضل
۶۶۔ محترمہ صاعقہ امین	ایم۔فل	شاعرِ مشرق اور شاعرِ نیل: ایک تنقیدی مطالعہ	پروفیسر بشیر احمد نحوی / ڈاکٹر شاد حسین
۶۷۔ جناب شبیر احمد بٹ	ایم۔فل	مظفر حسین برنی کی کلیاتِ مکاتیب اقبال: جلد اول کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر فرید پربتی
۶۸۔ جناب خورشید احمد	ایم۔فل	اقبال کی دو بیتیوں کا فنی اور موضوعاتی مطالعہ	ڈاکٹر فرید پربتی
۶۹۔ جناب ملک محمد طارق	ایم۔فل	ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ حیدر آبادی تلمیذ اقبال حیات اور کارنامے	ڈاکٹر فرید پربتی
۷۰۔ جناب معراج الدین لون	ایم۔فل	اقبال کی شاعری کا ہیتی مطالعہ	ڈاکٹر فرید پربتی
۷۱۔ محترمہ لبنیٰ محمد	ایم۔فل	اقبال کا تصورِ تاریخ: ہسپانیہ میں مسلم عروج وزوال کے تناظر میں..... ایک تحقیقی مطالعہ	پروفیسر بشیر احمد نحوی
۷۲ محترمہ پروینہ حبیب	پی ایچ۔ڈی	فکرِ اقبال میں تصورِ یزداں واہرمن	پروفیسر تسکینہ فاضل
محترمہ شمیمہ مقبول	ایم۔فل	انقلابِ ایران میں اقبال کی فارسی شاعری کا حصہ	پروفیسر تسکینہ فاضل / غلام رسول جان
جناب اعجاز احمد لون		Iqbal's Reconstruction of Self and Society (A Sociological Perspective)	پروفیسر تسکینہ فاضل / ڈاکٹر پیرزادہ محمد امین

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائریکٹر پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ انہوں نے کشمیر میں رہ کر ادارے کو ملک اور بیرون ملک، اقبالیات سے متعلق تحقیق وتنقید کے اہم مرکز کی حیثیت سے متعارف کروا کے جامعہ کشمیر کی اہمیت اور وقار میں اضافہ کیا۔ ان کی لگن اور محنت سے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ایک بہترین کتب خانہ قائم ہوا۔ اس کتب خانے میں عالمی سطح کی معیاری کتابیں موجود ہیں اور تحقیق کی سہولتوں

کے لئے جناب عبداللہ خاور نے اقبالیاتی اشاریہ مرتب کیا ہے۔ ''مفتاح اقبال'' نامی یہ اشاریہ اپنے آپ میں ایک منفرد اشاریہ ہے۔ مرحوم سرور صاحب نے اردو زبان وادب کی جو خدمت کی ہے اس کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، ادیب، نقاد، اور دانشور تھے۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر لکھا ہے، اقبالیات پر انہیں غیر معمولی دست رس حاصل تھی۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے۔

روشنی عام کرو فکر و نظر پاک کرو
یہ جنوں اور بھی سرکش و بے باک کرو

سرور صاحب کے ہی دورِ نظامت میں پروفیسر کبیر احمد جائیسی ادارے کے درس وتدریس کے لئے تعینات ہوئے، موصوف علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور فارسی کے ایک بڑے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرین اقبالیات میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں کئی اردو اور غیر اردو انجمنوں نے اپنے اعزازات سے نوازا ہے۔ سرور صاحب ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر رہے۔ ان کے بعد کچھ عرصے کیلئے صبیح احمد کمالی نے ۱۹۸۸ء سے ۱۹۸۹ء تک یہ کام انجام دیا۔ کمالی صاحب فلسفہ کے طالب علم تھے، آپ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی، کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی وفارسی اور گھانہ یونیورسٹی کے شعبہ مذہبیات میں درس وتدریس کا کام بحسن خوبی انجام دے چکے تھے۔ پروفیسر کمالی صاحب کینڈا کی میک گل یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طالب علم تھے اور وہیں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ کمالی صاحب کے بعد پروفیسر محمد امین اندرابی نے اپنی صلاحیتوں سے انسٹی ٹیوٹ کو آگے بڑھایا۔

پروفیسر محمد امین اندرابی جموں وکشمیر کے مایہ ناز اقبال شناسوں میں گنے جاتے ہیں۔ آپ نے نامساعد حالات میں ادارے کی نظامت سنبھالی۔ پروفیسر اندرابی نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ایم۔اے اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اندرابی صاحب کی سبکدوشی کے بعد ادارے کی زمامِ کار پروفیسر بشیر احمد نحوی کے ہاتھوں میں آئی۔

نحوی صاحب ایک معروف علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' اُن کے والد بزرگوار ایک نامور اُستاذ' مقرر اور شاعر کی حیثیت سے پورے جنوبی کشمیر میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں۔ انہیں کی تربیت میں

جناب نحوی صاحب پروان چڑھے اور بلندیوں کو چھوتے گئے۔ جناب نحوی صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔اُن کی نگرانی میں اب تک تقریباً ۱۳۲ ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

اَب ڈاکٹر تسکینہ فاضل صاحبہ اپنی قابلیت اور پختہ شعور کی بنیاد پر ادارے کو نئی منزلوں کی اور لے جانے میں رواں دواں ہیں۔آپ کا شمار اُن اقبال شناس اور شاہین طبیعت خواتین کی پہلی صف سے ہے جو اقبالیات میں نئے باب رقم کرنے جا رہی ہیں۔آپ نے اقبالیات کو ایک نئی جہت دی، محترمہ مشہور نعت گو شاعر مرحوم فاضل کشمیری کی صاحبزادی ہیں، محترمہ نے صحافت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا، محترمہ کا شمار سنجیدہ محققین اقبالیات میں ہوتا ہے، تسکینہ جی کی کئی مطبوعات منظر عام پر آ چکی ہیں اور جن کی پذیرائی پورے برصغیر ہند و پاک میں ہوئی ہے۔ پروفیسر تسکینہ فاضل کی نگرانی میں تقریباً ۱۱۵ ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ان کی مساعی جمیلہ سے انسٹی ٹیوٹ ایک نئی راہ کی اور گامزن ہے، انشاءاللہ تعالیٰ ان کی کوششوں سے عنقریب انسٹی ٹیوٹ بحیثیت ایک مرکز کے کام کرنا شروع کرے گا اور اقبال انسٹی ٹیوٹ ''مرکز برائے اقبالیات اور تقابلی مطالعہ'' (Centre for Iqbaliyat and Comparative Studies) کے نام سے ''تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں'' کے مصداق ایک نئی پرواز کی اور گامزن ہونے جا رہا ہے۔

مشہور نقاد اور شاعر ڈاکٹر فرید پربتی[1]، کا شمار ریاست کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے، اُن کی تقریباً ۱۰ سے زیادہ مطبوعات منظر عام پر آ چکی ہیں، اُن کے اعزاز میں کئی رسائل نے خصوصی شمارے شائع کئے ہیں، انہیں مختلف اکادمیوں نے اعزازات سے بھی نوازا تھا۔وہ رباعی پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔

ہر عمل ردعمل رکھتا ہے
ہر اچھا بُرا اپنا بدل رکھتا ہے
میں اُس پیڑ کے سائے تلے بیٹھا ہوں
جو پیڑ پھول نہ پھل رکھتا ہے

---

[1] (ڈاکٹر فرید پربتی حال ہی میں انتقال کر گئے)

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کی طرف سے سال رواں ۲۰۱۲ء کے لئے ایم فل اور پی ایچ ڈی اسکالروں کو تفویض کئے گئے موضوعات کی فہرست

۱۔ اقبال اور تحریکِ حریت کشمیر از غلام نبی خیال۔ ایک مطالعہ۔ شگفتہ مجید

۲۔ Self Realization in Iqbal's Thought: Qaima JAn

۳۔ Symbolism and Social Concerns in the Poetry of William Blake and Iqbal: Masooda Jahan Ara

۴۔ Western Critics on Iqbal : Tehmeena Husain

۵۔ Concept of Knowledge in Rumi and Iqbal : Sameer Shafi Siddiqi

۶۔ ملک حسن اختر بحیثیت اقبال شناس۔ شگفتہ رحیم

۷۔ علامہ اقبال اور سر عبدالقادر۔ ایک مطالعہ۔ گوہر احمد بیگ

۸۔ ندوۃ العلما لکھنؤ اور اقبال شناسی۔ ایک مطالعہ۔ رخسانہ رحیم

۹۔ اقبال اور جوش کی منظری شاعری کا تقابلی مطالعہ۔ آغا محسن

۱۰۔ Iqbal and Shelly-A Comperative Study of Selected texts: Samina Hafiz Khan

۱۱۔ اُردو نظم پر اقبال کے اثرات۔ بشیر احمد ڈار

۱۲۔ اقبال کی شاعری میں سماجی اور سیاسی فکر کی عکاسی (بال جبرئیل کے حوالے سے)۔ فیاض احمد بٹ

۱۳۔ اقبال شناسی میں محمد بدیع الزماں کا حصہ۔ ایک مطالعہ۔ لطیفہ نسرین

۱۴۔ Iqbal as a Post-colonial Poet: Tanveer Husain

۱۵۔ اسلام اور مغربی تہذیب کی کشمکش فکر اقبال کی روشنی میں:۔ شبینہ شبیر (پی۔ ایچ۔ ڈی)

۱۶۔اقبال اور تصور نبوت۔ایک مطالعہ:۔احسان الحق (پی۔ایچ۔ڈی)

۱۷۔ریاستی کلچرل اکیڈیمی کا اقبالیاتی ادب:۔عاشق حسین نایک

۱۸۔Socio-Political thought of Iqbal with special reference to Zarbi-Kaleem. Fayaz Ahmad Parrav

۱۹۔عبدالاحد آزاد کی شاعری پر اقبال کے اثرات:۔عرفانہ سلطان

۲۰۔Iqbal and Contemporary Society (A Sociological Perspective) : Anifa Syed Shah

۲۱۔عبدالقوی دسنوی بطور اقبال شناس:۔افشانہ نذیر

۲۲۔فکر شاہ ولی اللہ اور فکر اقبال۔ایک مطالعہ:۔محمد رمضان نایک

۲۳۔فکر اقبال اور علمدار کشمیر۔ایک مطالعہ:۔نذیر احمد کھانڈا

۲۴۔قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کی اقبال شناسی شعریاتِ اقبال کے حوالے سے۔شبنم اسد

۲۵۔اقبال کے انگریزی خطبات کے اُردو تراجم کا تقابلی جائزہ۔محمد حسین بٹ

۲۶۔حُب رسول اللہؐ فی الاعمالِ محمد اقبال۔سید مجاہد حسین

۲۷۔اقبال اور بھوپال۔گلزار احمد ڈار

۲۸۔The Poets of Nature: A Comperative Study based on the poetry of Iqbal and Wordsworth. Muhammad Ismail Mir.

۲۹۔اقبال کی تصنیف علم الاقتصاد کا جائزہ۔بشیر احمد ڈار۔

۲۰۱۲ء کے ایوارڈ یافتہ اسکالروں کے موضوعات

۱۔مظفر حسین برنی کے کلیاتِ مکاتیب اقبال (جلد اوّل) کا تنقیدی مطالعہ.....شبیر احمد بٹ

۲۔اقبال کی دو بیتیوں کا فنی اور موضوعاتی مطالعہ.....خورشید احمد

۳۔ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ حیدر آبادی تلمیذِ اقبال-حیات اور کارنامے.....ملک محمد طارق

۴۔اقبال کی شاعری کا ہیئتی مطالعہ.....معراج الدین لون

۵۔اقبال کا تصور تاریخ اسپین میں مسلم عروج وزوال کے تناظر میں۔(ایک تحقیقی مطالعہ)..... لبنیٰ محمد

۶۔ایرانی انقلاب میں اقبال کی فارسی شاعری کا حصہ.....شمیمہ مقبول

۷۔Iqbal's Reconstruction of Self and Society- A Sociological Perspective: Ajaz Ahmad Lone

۸۔اقبالیاتِ ڈاکٹر تحسین فراقی کا تنقیدی مطالعہ.....فدا حسین بٹ

۹۔غزل کی روایت اور اقبال..... جمشیدہ اختر

۱۰۔اقبال کا تصور آفاقیت.....فاروق احمد صوفی

۱۱۔کُنہ وُہ شتھ تہ شیٹھ پتہ اقبالنہ شاعریِ ہندی کا شِر ترجمہ.....تقابلی مطالعہ: حا۔م۔نذیر

۱۲۔فکر اقبال میں تصور یزداں واہرمن..... پروین حبیب (پی۔ایچ۔ڈی)

25. Mushir-ul-Haq, "Iqbal Ka Nazriyah Ijtihad Pakistani Mumal may", *Tahqiqat-i-Islami* Vol. 2, Aligarh 1983.
26. See the marginal notes of Maulana Jala-ud-Din Umari on late Prof. Mushir-ul-Haq's article in Ibid.
27. Supra. n. 23, p. 10.
28. Supra. n. 19, p. 166.
29. M.A. Hussian Ahanger, op.cit.p.12.
30. Ibid.
31. Al-Quran. 2:228
32. An Islamic scholar from Nadwat al-Uluma, lucknow, UP whose *Hindustan Ki Pahli Islami Tahrik,* Delhi, and *Muhammad bin Abdul Wahhab: Aik Badnam Musliha,* Delhi are regarded a valuable contribution to the 18th century Islamic history. For a detailed study on him see Dr. Abdul Majid Fazilis book on Maulana Masud Alam Nadvi Published form Delhi.
33. She was a famous modern scholar from Germany who had wide knowledge of Islamic philosophy, mysticism, and culture, including Iqbal's Philosophy. She spend much of her life in Turkey and Indo-Pakistan world and after working at Bonn University she taught at Harvard University, USA till her retirement. She passed away in 2003. Among her main writings include *Mystical Dimension of Islam, Gabriel's Wing, The Triumphal Sun* and *Muhammad is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islam.*
34. M.A. Husian Ahanger, op.cit. P. 15
35. Ibid.
36. Ibid.p.19.
37. Ibid. P. 25.

student of Prof. M. M. Sharif who edited the monumental work *A History of Muslim Philosophy*, Pakistan and the former produced translation of al-Ghazali's *Tahafat-ul-Falasafa* under the title, *Incoherence of the Philosophers* (Philosophical Congress, Lahore). He is known for this famous work in the academic circles all over the world. He has written even many other articles on Islamic philosophy and Iqbal. For details see the present author's brief essay on Prof. Sabih Ahmad Kamali in *Arab and Islamic Perspective*, Delhi, 1995. It is worth to note here that many of the valuable articles of Prof. Kamali are not easily accessible to the researches and academicians interested in Islamic philosophy and Iqbal's thought. To take up the compilation,editing and publication of these articles by any academic Institute or publishing academy in India or Pakistan will be a good contribution to Islamic thought and Iqbal Studies.

12. Supra. n. 8
13. Ibid.
14. See M.Taqi Amini, *Fandamentals of Ijtihad*, Idara Adbiyat Delhi.
15. S.M. Iqbal, *The Reconstruction of Religious thought in Islam*, Kitab Bawn, Delhi 1974, p.146.
16. M.A. Hussian Ahangar, "Iqbal and the Quran: A Legal Perspective", *Iqbal and the Quran*, Iqbal Institute University of Kashmir, Srinagar compiled by Prof. Muhammad Amin Andrabi, 1994, p. 4.
17. Ibid. P. 6.
18. Ibid. P.56.
19. Supra. n. 15, p.146.
20. Ibid.p.115.
21. M.A.Hussian Ahangar, op.cit,p.7
22. Supra.n. 15 p.165.
23. M.A. Hussian Ahanger, op.cit.p.9.
24. Ibid.p.10.

References and Notes

1. For example see the publications of Iqbal Academy, Lahore. Iqbal Institute of Culture and Philosophy Srinagar, the publishing agencies of New Delhi and Hyderabad relating to the subject.
2. The reason is that neither the Department of Law, University of Kashmir nor the Madrasas here showed the interest in Iqbal's legal thought which would have otherwise highlighted the substantial aspect of Iqbal's legal thought.
3. His paper has been probably published in *Iqbaliyat*. He was a serious scholar in Urdu literature and Iqbaliyat who served to Iqbal Institute of Culture & Philosophy for about three decades. He desired to publish some of his last written articles but unfortunately could not do so due to his sudden death in Dec. 2001.
4. His writings have been published in *Iqbal Review*, Lahore, *Insight Islamicus*, University of Kashmir and *Iqbal and the Quran*, University of Kashmir Srinagar.
5. His paper has been probably published in a magazine published by the Dean Student's Welfare, University of Kashmir, Srinagar in early ninetees.
6. Dr. Mushtaq Ahmad Ganai is a budding scholar in Iqbaliyat who has published a number of papers on Iqbal's thought including legal thought. However his *Nazariyah Ijtihad aur Iqbal* is fully devoted to the present theme.
7. It has been published by Munib-ul Haq publications, Seer, Sopore, Kashmir, 2003.
8. See Supra n.4.
9. Ibid.
10. It has been published in *Iqbal and the Quran* under the title, "Iqbal and the Quran: A Legal Perspective", Iqbal Institute University of Kashmir, Srinagar, 1994, pp.1-34.
11. Prof. S. A. Kamali also served as Director, Iqbal Institute of Culture and Philosophy Srinagar for several years. He was

necessity and justification of re-interpretation of the Quranic principles and laws in the new situation and little is to be depended on the early jurist's decrees. In this regard he also refers to Justice Muhammad Shafi the prominent Islamic scholar and chief Qazi of Pakistan, who says:

> If the interpretation of the holy Quran by the commentators who live thirteen or twelve hundred years ago is considered as the last word on the subject, then the whole Islamic society will be shut up in an iron cage and not allowed to develop along with the time . It will then cease to be the universal religion and will remain a religion confined to the time and place when and where it was revealed.[37]

4. Conclusion

From the above, we can bring out that Prof. Ahangar has discussed the various aspects of Iqbal's treatment of the Quran as a source of Islamic law. The nature of its metaphysical and spiritual truths, according to Iqbal, related to the temporal and social domains of life. The Quran provides both foundational as well as concrete principles for guidance of social life. Ijtihad is a re-interpretation activity which is to exercised to discover the laws of Islam in the new circumstances. To Prof. Ahangar, Quranic legislation, in Iqbal, manifests permanence and change and it is, at the same time, universality of Islam. While making some critical observations about Iqbal's legal thought, Ahangar explores the scope of further studies on it particularly in the light of new re-interpretational activities of Islamic law under the growing challenges faced by Muslims in Pakistan and India. Though the author has least touched the other aspects of Iqbal's treatment like *maqasid-i-Shariah* (objectives of Shariah) and the collective ijtihad, here yet,on the whole the attempt depicts the considerable insight of the author in the subject and marks an outstanding contribution to study of legal thought of Iqbal. It can be suggested here that to present a total view of the author about the subject his other three papers need to be studied as well.

I have not been able to comprehend, the commandments relating to wills.[30]

Again referring to Turkish Poet, Zia Gokalp's plea in making change in Islamic family law in terms of equality for women in divorce, separation and inheritance, Ahangar quotes the long passages from *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* in which Iqbal amplifies the just rights of a woman in Islam in terms of property and marriage and divorce. To Iqbal, it is the equality of due rights granted to man and woman in Islam:

And for women are rights over men similar to those over women.[31]

While referring to the letter of Iqbal to Maulana Masud Alam Nadvi[32] and the comment of Annemeri Schimmel[33] on it, Prof. Ahangar thinks that Iqbal was also enquiring about the possibility of change in penal laws in Islam. In the latter, reference is made to the Prophet's practice of not cutting the hands of a thief during the war and the decrease or increase of infancy period for child which is of two years.[34] Schimmel's observations on the issue are also quoted here by the author which, in his view, comments on the above mentioned letter of Iqbal and Nadvi. On the basis of this, Prof. Ahangar holds that Iqbal was somewhat not ready to accept Quranic legislation for crime in all circumstances. To him, it is a paradox in Iqbal's legal thought.[35]In our view, Iqbal was seeking answers about the inheritance and punitive laws from the great traditional scholars of Islam *(ulama)* of his time for their amplification to guide the people in these important spheres of social life. This could highlight the validity of Islamic economic ethical system of life. It was the least concern of Iqbal to seek change in *nasus* (textual) laws of Islam.

In the concluding part, Prof. Ahangar discusses the issue of re-interpretation of ijtihad. It seems that he is concerned here with Iqbal's view of re-interpretation of ijtihad.[36] This implies that ijtihad which itself is interpretation of law of Islam in new circumstances and undergoes for further interpretation by the scholars. Ahangar elaborates it in the context of the observations of various judges, lawyers and legal ordinance of Pakistan. This illustrates the

the Quran as a legal code and referring specifically to the Prophet's role in amplifying the Quran its principles and laws and even extending them by his delegated legislative powers and it never means that he is marginalising *ijma,* as the Professor thinks, Here also, the Professor, touches upon the distinction of the Quranic legal nature or its having legal verses and describes their incorporation in the Quran as compulsiveness of the past crisis and conflicts in Judaism and Christianity.[27] One turning to extreme legality and the other to extreme other worldliness. Although the learned author wants to highlight the point which Iqbal is making here regarding the legal nature of the Quranic verses yet to term it 'compulsiveness' seems a loose and inconsistent statement. However the crisis with which the Christianity suffered and which Iqbal has viewed deeply is found, as the author highlights, in its separation from state, law and temporal institutions. The Quran is brought for mankind both with the religion and temporal institutions. This is substantiated well by the author through Iqbal following statement:

> Thus the Quran considers it necessary to unite religion and state, ethics and politics in a single revelation much in the same way as Plato does in his *Republic.* [28]

In the fourth section of his paper, Prof. Ahangar elaborates that the Muslims generally believe that legal verses of the Quran are eternal and unchangeable. To him Iqbal's views are not uniform in this regard. He contends that, no doubt, Iqbal says the Quran has laid down injunctions about inheritance, marriage, polygamy etc. which are not to be changed and these rules are of eternal nature yet on the other hand, says Ahangar, Iqbal was preoccupied with the question of eternity and non eternity of the Quranic rule for a large time.[29] A letter to Syed Sulaiman Nadvi indicates his inquisitiveness about the matter:

> Inheritance verses relating to shares are inherently eternal or only the rules which relate to inheritance regulations are unchangeable and there can be change and in shares according to circumstances.

Thus secular is not devoid of spiritual and is equally sacred. Here the author also mentions briefly about Iqbal's concept of change and permanence in Islam and describes that Iqbal by change never means absolute replacement of the existing superstructure of Islamic society but a change of positive nature. It will be useful if it is made within the limits of foundational principles of Islam.[21]

In the third and fourth sections the main contents of Iqbal's views about this primary source of law are discussed by the author. At the outset, it is said that Muslims believe in revelatory character of the Quran with its primacy and eternal validity as guidance for all spheres of human life. So is the case with Iqbal, as he says, that the primary source of the law of Islam is Quran. The Quran, however, is not a legal code.[22] Prof. Ahangar views this statement in which Quran is duely recognised by Iqbal as the primary source of law, yet Iqbal, as views Ahangar fails to explain the reason for its not serving as a legal code. According to the Professor, it is Riyaz al-Hasan Gilani who explains the specific reasons for it.[23] These reasons lie in its appeal to convince man to submit to God's sovereignty and persuade him to liberate himself from the other bonds. It lays down law at the proper places and points out, as well that the legislative powers have been delegated to the Prophet (SAAS).[24] If the Quran had itself described all the principles and details of Islamic society and culture. Islam would have not seen practicable, at least for a common man. Late Prof. Mushirul Haq has also raised the question on Iqbal's not describing the Quran as a legal code in one of his articles.[25] However, it is clarified by other scholars by saying that by legal code Iqbal is meant that the Quran is not legal code in the strict modern sense of the term but has legal norms and rules to guide completely in his social affairs.[26] It provides guidance both for spiritual as well as secular life of man.

In the end of the third section, Prof. Ahanger mentions his disagreement with R.H.Gilani who says that delegation of legislative powers were given to the Prophet (SAAS) alone and the former holds that they were given to Muslim Ummah as well. It seems that Dr. Gilani was talking about the reasons of not terming

Islamic law. The primary sources are the Quran, Hadith, Ijma and *Qiyas*. Iqbal deals more with these four sources in his legal thought than the other subsidiary ones, in the sixth lecture of his famous work, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*: The title of the lecture is 'The Principle of movement in the Structure of Islam' which Nizar Niyazi translates as *"al-ijtihad fil Islam"* [15]

Prof. Ahangar's treatment of Iqbal's thought about the Quran as a source of Islamic law is his first attempt on this specific subject. This is discussed in his paper " Iqbal and the Quran: A Legel Perspective", published in Iqbal Institute's edited book, *Iqbal and the Quran in 1994*. The Paper is comprehensive, analytical and well documented. It depicts author's special and critical interest in Iqbal's legal thought.

The paper, in its first section, touches upon Iqbal's deep concern with the Quran, the only authentic version of Divine revelation and guidance available to mankind at present. Iqbal's commitment to the study of the Quran and reflecting on its contents is mentioned in the light of some of his verses, letters and views of Maulana Maududi, Annemarie Schimmel and Mirza Jalal-ud-din.[16] Here he also discusses Iqbal's perception about the distinctive nature of the Quran. The latter is qualified as the Book having metaphysical truth with finality and it is the Book by which instead of natural and racial considerations, complete human consciousness and realisation is developed.[17] Its ethical and legal relevance to modern times is made clear by referring to Iqbal's broader vision about it that any person who analyses contemporary jurisprudence on legal fundamentals from Quranic view point and proves eternity and permanence of Quranic principles, he would be *mujadid* (revivalist)of Islam and a great servant of mankind.[18]

Besides this perception of Iqbal about the Quranic guidance, Prof. Ahangar mentions its other distinctive features which characterise this divine book as basically an awakener in man towards 'the higher consciousness of his manifold relations with God and universe'.[19] Iqbal also describes that 'the ultimate reality as essentially spiritual and its life consists in its temporal activity'.[20]

2. Prof. Muhammad Altaf Hussain Ahangar and his Scholarship in Legal Thought

Prof. Altaf Ahangar is a scholar of repute in conventional law. He studied law at Aligarh Muslim University, Aligarh and taught the subject at many leading national and international universities. Earlier he taught law in Kashmir University, and then joined the University of Nigeria for some years. In early nineties, he was appointed as Associate Professor and soon Professor of law in International Islamic University, Malaysia, Kulumpur, where he worked up to 2010. Presently he is working as professor of law in Brunei. Basically a scholar of conventional law that got devised by the British and later on revised by the Asian countries after attaining their freedom, yet Prof. Altaf studied Islamic family law and even taught it in various universities. It is probably due to this expertise of the scholar that he felt interest in Iqbal's thought in general and his legal thought in particular. Moreover Prof. Saihib Ahmad Kamali has become instrumental in persuading Prof. Ahangar towards studying Iqbal. Nevertheless, he has made a worthwhile study in it and contributed as per the present authors' knowledge, almost four articles to this subject. Two are related to Iqbal's approach to the Quran and Hadith respectively as the basic sources of *ijtihad* and the other two deal with ijma' in Iqbal. Again two of them have been published from Kashmir University, Srinagar [12] while the other two are from Iqbal Academy; Pakistan.[13] Here our concern is only with his one paper which deals with Iqbal's views about the Quran as a source of Islamic law.

3. Prof. Ahangar on Iqbal's Approach to the Quran as a source of ijtihad

As it is a well known fact that Iqbal had a great concern with *ijtihad* both in its broader terms of Islam and its legal context. In its legal context it stands for the reinterpretation of Islamic law (by exercising one's intellect) in the new ages. It involves the reinterpretation of laws of Islam as well as formulation of new laws on the subsidiary matters of life.[14] For this purpose the scholars of *usul* have enumerated four primary and many subsidiary sources of

Studies on Iqbal's Legal Thought in Kashmir:
An approach to Prof. Muhammad Altaf Hussain Ahangar's Paper

Dr. Abdul Rashid Bhat.

1. Introduction

Allama Iqbal is regarded as one of the greatest personalities of the modern Muslim world. The Western and the Eastern scholars and intellectuals have recognised profundity and versatility of his thought. As rooted in the Quran and Sunnah, furthering his learning by studying the Western philosophy and law and accessing to Muslim classical works on various sciences *(ulum)*, Allama succeeded in evolving his distinctive thought of Islam. It is multi-dimensional, profound and appealing. It manifests many thought sub-categories in it like political, legal, social, psychological, and epistemological. Each of these dimensions of thought has been treated by scholars and researchers across the world. With regard to Iqbal's legal thought or philosophy a number of studies have come out. Many of them are of high standard nature[1] while others are either reasonably good or of low academic quality. In Kashmir too, legal thought of Allama Iqbal has also become an interesting subject of study in one way or the other. However, unlike other themes of Allama's thought this one has been specifically attended by merely few scholars.[2] They as per my knowledge are Late Prof. M. A. Andrabi, [3] Prof. Altaf Hussain Ahangar, [4] Dr. Muhammad Afzal Wani[5] and Dr. Mushtaq Ahmad Ganai.[6] Prof. Andrabi and Dr. Wani's studies are in the form of two articles which have been published in early ninetees of the last century. Dr. Ganai's study, *Nazriya Ijtihad aur Iqbal* is the revised form of his Ph.D thesis. It constitutes a full-fledged study of this theme of Iqbal.[7] Prof. Ahanger has dealt the theme in his four articles published in Kashmir[8] and Pakistan.[9] The present paper makes a humble attempt to examine his treatment of Allama Iqbal's legal thought focusing on one of his papers relating to Iqbal and the Quran.[10]

vibrant and inclusive. However, more research is needed on the Reconstruction of Iqbal especially the aspects of Ijtihad as was already mentioned by Prof. Saroor. It is very heartening that Dr Mushtaq Ganai has worked on this subject in a commendable manner, but still this theme is worth more and more delibrations in the whole philosophical system of Iqbal.

Iqbal's thought is very fresh and it has the relevance to modern time because the problems which were being faced by Iqbal are still there and the imperialist designs against Islam and Muslims against which Iqbal fought relentlessly persist. Iqbals philosophy of time, views on Khudi, science and religion, Ijtihad and vitalist vision are the areas which can be probed in light of modern developments worldwide.

by Iqbal in literature both in Persian and Urdu. This very important dimension has been highlighted by the Institute through its publications, seminars, conferences and extension lectures, and in the second category fall the literary and academic activities of the Institute which detail its contributions towards understanding Iqbal's works in prose, his letters and lectures and especially Iqbal's magnum opus The Reconstruction of Religious Thought in Islam.

Third activity of the Institute has had been to promote Urdu and Persian language as both these languages were chosen by Iqbal to express his great ideas and present a global vision of Islam before the world through the medium of localised Urdu and globally viable Persian.

Iqbal's universal and vitalist message could be easily discerned from his English lecture series now found in form of The Reconstruction of Religious Thought in Islam.

In this category can be included the valuable contributions made by the Institute towards understanding the Seerah of the Prophet (SAW) and conduct of the naatia and Husaini poetic sessions almost every year from last several years now.

Moreover this 31 year old Institute producing 62 Phd's and M.Phil dissertations and theses.

Apart from Formal activities, the Institute has so far distributed, about 2,0000 stickers, containing Urdu and Persian couplets of Iqbal, free of cost. Mobile seminars and symposia were also conducted by the Institute almost at all important townships of Kashmir throughout these years after Prof. Bashir Ahmad took over the charge of Directorship of the Institute.

Some important research publications were published like letters of Iqbal, Iqbal and Humanism, Iqbal and Arab world, the Stalwarts in Iqbal's thought, and Critical Review of Iqbal's Reconstruction etc during this period.

During the directorship of Prof. Nahvi some important assignments were taken in hand by the institute and visiting fellows like Professor Abdul Haq, Prof Margoob Banhali and Dr. Badruddin Bhat were engaged to make studies on Iqbalian thought more

Institute. Therefore any research on Iqbal requires acumen and the versatility on the part of the researchers. Therefore apart from these formal programmes, Iqbal Institute has the vintage point of being the hub of intellectual and academic activities from very begining which has continued uninterrupted till date and as a matter of fact almost all important experts on Iqbal have visited this Institute and delivered lectures here, these include Annemarie Schimmel, Alam Khundmiri, Maulana Taqi Ameeni Prof. Syed Vahiduddin, Sayeed Ahmad Akbarabadi, Abul Hassan Nadvi, etc. Moreover the best academic and scholarly giants like Aali Ahmad Saroor (Famous literary critic, thinker and a famous Urdu writer), Sabih Ahmad Kamali (The translator of Imam Ghazzali's famous classic Tahafut al Falasifah), Kabir Ahmad Jaisi (a renowned Islamic and Persian Scholar) etc have worked as the directors of this Institute.

Thus the Institute was fortunate enough to have been directed by these well meaning and erudite scholars and luminaries who were in real sense of the world the true heirs of the cultural and literary heritage and traditions Iqbal was representing in the wider sense of the term.

Prof. Saroor as a director for ten years guided all the activities of this Institute and after him for about one and half years Prof. Sabih Ahmad Kamali became director of the Institute. Dr Muhammad Amin Andrabi was the next director when the former director left valley and he remained director of the Institute for about 11 years and finally Prof. Bashir Ahmad Nahvi became director in 1999. He was succeeded by Prof. Taskeena Fazil as the director of this prestigious institute, which is now known as Iqbal Institute of Culture & Philosophy. Prof. Taskeena Fazil herself an established scholar of Iqbalian Studies.

The publications of the Institute are a valuable addition to the literature produced on Iqbal anywhere in the world. There have been three kinds of activities carried on by the Institute. First can be seen in form of the researches made on Iqbal from the Institute. In this category are included the glorious traditions set in motion

in this seminar apart from other scholars; Prof. Miushirul Haq also had participated.

In 1983 a seminar on Sufism in India was held and in 1984 a seminar on Iqbal and Urdu Nazm was organised . In the same way in 1984 a seminar was held on Urdu Poetics.

Apart from seminars and conferences extension lectures were also arranged during the tenure of Prof Saroor and some prominent scholars like S K Ghosh Prof. Daya Khrisnan, Khushwant Singh. Prof. A. T. Ambary, Prof. Syed Vahiddudin, and Syed Hamid are among the famous scholars who were invited to deliver lectures. Annemarie Schimmel was also invited to deliver lectures on Islam and mysticism and she was the honorary visiting fellow of the Institute during the directorship of Prof. Saroor. It is pertinent to mention that the world renowned scholar and Shah Faisal Awardee Abul Hassan Nadwi gave lectures on Islam in Modern age in the Institute.

After the Directorship of Prof. Saroor, Muhammad Amin Andrabi took charge in 1987 as incharge director for two years and afterwards Sabih Ahmad Kamili remained director for about one and a half year and in 1990 Dr. Andrabi was appointed director again and in all he was director for about 11 years. He held a seminar on the Metaphor in Iqbal's poetry in 1997 and also on Iqbal's Persian poetry, Iqbal's poetry and rhetoric, and in 1992 on Iqbal and Quran. etc

In 1995 and 1996 an Seminar was held on Iqbalian studies in Kashmir and Jammu respectively In 1999. Prof. Andrabi retired and Bashir Ahmad Nahvi became the Director of the Institute.

During the tenure of Prof. Nahvi, the Institute got a new vigour and vitality and seminars and conferences on the Prophetic Seerah, education, Iqbal and charecter Building, Review of works on Iqbal were held alongside the regular programmes on Iqbal. A seminar was held on the great Iqbalian scholar in 2003, entitled Jagan Nath Azad.

Iqbals thought and Philosophy is multi dimensional and very holistic as well as eclectic in nature, so are the contributions of this

eulogising attitude of some circles had added more confusions about Iqbal's real stature. But according to Prof. Saroor in the Philosophy of Iqbal Ijtihad was of cardinal significance as was the modernist trend of his poetry. (P- 131).

First point to be considered in the opinion of Prof. Saroor was that before everything else Iqbal was a poet. His Voice was individualistic as well as social in its nature as he had engaged himself in a social discourse. He was both romantic and modernist but he was nevertheless conscious of his traditions and his classical background. Iqbal no doubt was against westernization but not against modernisation. He just objected to the atheistic capitalistic and mechanical thought and system and not the science and its control mechanics a land and waters, or the sovereignty and freedom, social consciousness, social service etc brought along with the march of western civilisation (Pp-132-33).

Therefore Prof. Saroor laid emphasis on the detailed study of Iqbal's thought. In light of Iqbal's literary tradition his experiences and their meaning needed to be established. Iqbal was against the philosophy of Sufism but not against its temperament, he upheld its humanist traditions and accommodative nature, according to Prof. Saroor."In the same way Iqbal was an intellectual and never was opponent of intellectualism".

Thus Prof. Saroor laid down the ideals of Institute for future. He worked singlehandedly for two years and arranged seminars and extension lectures on Iqbal.

In 1979 Amin Andrabi was selected as lecturer and in 1980 Kabir Ahmad Jaisi was appointed as Reader in the Institute.

A seminar was held on Iqbal and Sufism in 1977 and it was inaugurated by Shaikh Muhammad Abdullah and scholars like Sayeed Akbarabadi, Aalam Khundmiri and Jagan Nath Azad had participated in this seminar.

In 1978 another seminar was held on Iqbal and the West. In 1979 a seminar was held on the Islamic Resurgence. The other seminars which were held related to poetics of Iqbal,Fani Badauni, Hasrat Mohani. A seminar on Iqbal and Modernism was held in 1981 and

Iqbal Institute and Contribution to Iqbalian Studies

Prof. Hamid Naseem Rafiabadi

Jagan Nath Azad once remarked that Iqbal had a love relationship with the people of Kashmir as he was Kashmiri by race and a well-wisher (Gham gusar) of the Kashmiris. Till his last breath his concern with Kashmir has never faded away.

Kashmir has had been famous for its literary and scholarly past and Iqbal was one of the most glittering stars in the glaxy of the luminious personages of Kashmir. Iqbal has earned a name in the world of Philosophy and scholarship that no other person could even envy. The books and articles on him exceed 5000 in about 40 languages of the world.

It was in backdrop of this reality that in 1977 Iqbal Chair was installed in Kashmir University by the directive of the former Cheif Minister of J & K late Sheikh Muhammad Abdullah. Aali Ahmad Saroor was made the first Iqbal Professor and it was after two years in May 21, 1979 that due to the efforts of Aali Ahmad Saror the Chair was designated as Iqbal Institute and its academic and research activities started. Iqbal institute Kashmir University is one of the pioneering institutes which has some peculiarities and has proven its worth beyond doubt. The Institute is now Christianised as Iqbal Institute of Culture & Philosophy. From its inception till date the Institute has organised many seminars, published scores of books organised hundreds of extension lectures and conducted innumerable conferences apart from producing many research scholars who have worked on the noval and variegated dimensions of the art, poetry and thought of the poet philosopher of the East.

Aali Ahmad Saroor has, in a sense, set the future agenda for the Institute in his inaugural address. He had maintained that in Iqbal both the self realisation and awareness about the universe was intertwined (P- 131)

In this speech Prof. Saroor had lamented that the progressive writers had not done justice with Iqbal but on the other hand the

ISSN 0975-6604

Iqbaliyat

Vol. 21

Edited by

Prof. Taskeena Fazil

Iqbal Institute of Culture & Philosophy
University of Kashmir, Srinagar